1953ء کی تحریک ختم نبوت کی دلخراش داستان

از

امین الحسنات علامہ سید خلیل احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

ناشر: مرکزی مجلسِ امامِ اعظم

1953ء تحریکِ ختم نبوت کی ایک دلخراش داستان

جب مجھے سزائے موت سنائی گئی

امین الحسنات علامہ سید خلیل احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مرکزی مجلس امام اعظم

دفتر ظہور پلازہ تھرڈ فلور، دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور

0333-7861895

بانی مجلس

مترجم کتب احادیث علامہ عبدالحکیم خان اختر شاہجہان پوری مجددی مظہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر نگرانی: محمد کاشف رضا

نام کتاب : جب مجھے سزائے موت سنائی گئی

مصنف : امین الحسنات علامہ سید خلیل احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

ناشر : مرکزی مجلس امام اعظم

ضخامت : 48 صفحات

تعداد : 1100

سن اشاعت : 2024ء

ہدیہ : دعائے خیر بحق اراکین ومعاونین

نوٹ : اراکین کے علاوہ بیرون جات کے شائقین علم 25 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ

مرکزی مجلس امام اعظم (رجسٹرڈ)

دفتر ظہور پلازہ تھرڈ فلور، دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور

0333-7861895

سنگ ریزے

محمد کاشف رضا

1953ء کی ''تحریک تحفظ ختم نبوت'' تاریخ پاکستان کا دلخراش باب ہے، جس کا ہر حرف ولفظ لہو رنگ ہے۔ لاہور کی سڑکوں پر ختم نبوت کے شہیدوں کا لہو رزقِ خاک ہوا۔ بوڑھے فلک نے ''جنگ یمامہ'' کے بعد یہ منظر ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا۔ بوڑھے فلک کا دل لہو ہو گیا ہو گا، جبر و قہر کی فضاؤں میں ''خالدِ جانباز'' کے سپاہی ''ختم نبوت'' کے لیے میدانِ کارزار میں تھے۔

1953ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت میں وہ اخبارات جو اسلام اور پاکستان کے نقیب و پاسبان بنے پھرتے تھے، ان کا بھرم کھل گیا۔ ''نوائے وقت'' کی لاتعلقی اور ''زمیندار'' کے ایڈیٹر مولانا اختر علی خاں کے شرمناک معافی نامے کا ذکر ''رپورٹ تحقیقاتی عدالت'' میں درج ہے۔

1953ء کے عہدِ ستم میں مسجد وزیر خاں لاہور تحریک کا مرکز بن گئی۔ تحریکی رہنماؤں مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی اور امین الحسنات علامہ سیّد خلیل احمد قادری کو سزائے موت سنائی گئی۔ زیرِ نظر کتابچہ مفتی سیّد دیدار علی شاہ کے پوتے مولانا سیّد خلیل احمد قادری کی روودادِ قفس ہے۔ کال کوٹھری میں گزرے لمحات کی دلخراش داستان ہے۔ جس کا لفظ لفظ حکایتِ خونچکاں ہے۔ 7 ستمبر 1974ء کو گزرے پچاس سال ہو چلے، قومی اسمبلی کے اس تاریخ ساز دن کو یاد کرنے کی خاطر عزیزم محمد طلحہ ندیم ہاشمی زید مجدہٗ نے تحریک پیدا کی اور تعاون کیا۔ ان ہی کے تعاون سے یہ کتابچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ختم نبوت زندہ باد۔۔۔۔مرزائیت مردہ باد

از: نباضِ قوم الحاج مفتی ابو داؤد محمد صادق قادری رضوی رحمۃ اللہ علیہ

سرور عالم نورِ مجسم ، شفیع معظم ، رہبر اعظم
جن کی رحمت عالم عالم ، ان کی رحمت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

تخت ہے ان کا تاج ہے ان کا ، دونوں جہاں میں راج ہے ان کا
مشرق و مغرب ان کی حکومت ، ان کی حکومت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

ان کی عظمت ان کی کرامت ، ان کی امانت ، ان کی صداقت
ان کی لطافت ان کی شجاعت ، ان کی عدالت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

رب ہے معطی ، یہ ہیں قاسم ، اس کے حکم سے سب کے حاکم
ان کی رسالت قائم دائم ، ان کی رسالت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

وہ ہی ہیں اول ، وہ ہیں آخر ، وہ ہی ہیں باطن ، وہ ہیں ظاہر
﴿لولاک لما﴾ کی ان سے نسبت ، ان کی نسبت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

آپ نے کھولا بابِ نبوت ، آپ ہیں خاتم دورِ رسالت
آپ کے ہی سر تاج رفعت ، آپ کی رفعت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

ہے جو بشر کی جائے نفرت ، مسلمانوں سے جس کو کدورت
جس نے اٹھائی ہر جا ذلت ، اس کی جہالت مردہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

مرزائیت کا ہے جو بانی ، دور غلام کی ہے نشانی
انگریز کا پودا ، انگریزی لغت ، انگریز کی لعنت مردہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

لوگوں دین محمد ﷺ رحمت ، دین سراپا خیر و برکت
دیں کے مجدد اعلیٰ حضرت ، اعلیٰ حضرت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

مہر علی شاہ ، صداقت ، بوالحسنات ہیں حسن اطاعت
پیر جماعت ، ماہِ فراست ، ان کی فراست زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

حق و صداقت کی ہیں نشانی ، شاہ نورانی شاہ نورانی
ان کی فراست جانی مانی ، ان کی فراست زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

کلمہ طیبہ پڑھنے والو ، دین نبیؐ پر مرنے والو
آؤ مل کر نعرہ لگاؤ ، ختم نبوت زندہ باد
ختم نبوت زندہ باد مرزائیت مردہ باد

☆☆☆

تاجدار ختم نبوت ﷺ

از: امیر المجاہدین علامہ حافظ خادم حسین رضوی حفظہ اللہ

الحمد لله و کفی والصلوۃ واسلام علی عبادہ الذین اصطفی خصوصاً علی سید الرسل و خاتم الانبیاء و علی آلہ المجتبیٰ و علی اصحابہ الاصفیاء اما بعد

حضور پرنور شافع یوم النشور سید عالم ﷺ کا آخری نبی ہونا ایسا واضح اور مسلمہ عقیدہ ہے کہ تاریخ اسلام میں جہاں اس مبارک عقیدے کو سینکڑوں قرآنی آیات و احادیث نبویہ اور اجماع امت تقویت دیتا ہے وہیں سابقہ کتب سماویہ میں بھی نبی کریم ﷺ کے متعلق آخری نبی ہونے کا ذکر موجود ہے۔ یہی عقیدہ امت مسلمہ کو وحدت کی ایک لڑی میں پروتا ہے اور اسی منصب ختم نبوت کی برکت سے قرآن کریم آخری آسمانی کتاب، امتِ محمدیہ آخری امت اور دین اسلام آخری دین ہے۔

قرآن کریم میں تو ﴿رسول اللہ و خاتم النبین﴾ کے الفاظ سے نبی کریم ﷺ کا آخری نبی ہونا بڑے واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔ آئمہ تفسیر میں ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لے کر امام سید محمد آلوسی تک آئمہ حدیث میں امام ابن حبان سے لے کر امام شیخ زین الدین ابن نجیم تک، آئمہ تصوف و سلوک میں امام غزالی سے لے کر امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم تک سب نے اس آیت مبارکہ سے یہ نتیجہ اخذ فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ختم نبوت کا تاج سید عالم ﷺ کے سر اقدس پر سجا دیا اور آپ کے بعد ہر قسم کی نبوت و رسالت کا سلسلہ اختتام پذیر ہو چکا ہے۔

دور رسالت ﷺ میں ہی اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب نے اس متفقہ عقیدہ کے خلاف دجل و کذب کا راستہ اختیار کر کے خود کو بطور نبی پیش کیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان دونوں کا بھرپور مقابلہ کر کے انہیں واصل جہنم کیا۔ اسود عنسی کو جب حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی منشاء سے واصل فی النار کیا تو سید

عالم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے تحسین کا یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ آج امت کے بہترین شخص نے بدترین شخص کو اس کے حقیقی انجام (موت) تک پہنچا دیا۔ اسی طرح جب مسیلمہ نے دعویٰ نبوت کیا تو آقا کریم ﷺ نے اسے "کذاب" فرمایا جو مستقل اس کے نام کا حصہ بن گیا۔

ان دونوں واقعات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت کرنے والا کذاب ہوتا ہے۔ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے افراد اُمت کے پسندیدہ افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت کرنے والے اُمت کے بدترین افراد میں سے ہیں۔ تحفظ ختم نبوت و ناموس رسالت ﷺ کے لیے کام کرنے سے نبی کریم ﷺ کو راحت ملتی ہے۔

عقیدہ ختم نبوت کی نزاکت وحساسیت کا اندازہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے اس قول مبارک سے بھی ہوتا ہے کہ جس میں کسی کا خود دعویٰ نبوت کرنا تو بہت دور کی بات ہے کسی دوسرے شخص کا نبی کریم ﷺ کے بعد مدعی نبوت سے اپنے دعویٰ کے متعلق دلیل طلب کرنا بھی کفر ہے۔ مناقب الامام اعظم ابی حنیفہ باب: 7 صفحہ 161 پر ہے: ﴿وتنها رجل فی زمن ابی حنیفة رحمة الله. و قال امهلونی حتی اجی بالعلامات، و قال ابو حنیفه رحمه الله: من طلب منه علامة فقد کفر بقول النبی ﷺ الانبی بعدی﴾ امام اعظم کے زمانہ میں ایک شخص نے دعویٰ نبوت کیا اور اس نے کہا مجھے مہلت دو تا کہ اپنی نبوت پر دلائل پیش کر سکوں۔ حضرت امام اعظم نے فرمایا: "جو شخص حضور ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت کرے تو کافر ہے ہی اور جو اس سے دلیل طلب کرے وہ بھی کافر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"

مسیلمہ کذاب کے بعد وقتاً فوقتاً مدعیان نبوت سر اُٹھاتے رہے اور اپنے انجام کو پہنچتے رہے تا وقتیکہ 1884ء میں انگریز کے زیر سرپرستی دجال قادیان مرزا غلام قادیانی کا فتنہ شروع ہوا۔ 1901ء میں مرزا قادیانی کے مستقل دعویٰ نبوت کے بعد اس فتنے نے ارتداد کی شکل اختیار کرلی۔

مرزا کے پر پرزے نکالتے ہی اہلسنت و جماعت کے علماء کرام اور مشائخ

عظام نے اس کا محاسبہ شروع کر دیا۔ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے مرزا قادیانی کا رد کیا۔ اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت امام شاہ احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے مرزا کے کفر وارتداد کا باقاعدہ فتویٰ جاری کیا۔ تاجدارِ گولڑہ حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی علیہ الرحمہ کو خود سرور کائنات ﷺ نے خواب میں اس فتنۂ مرزائیت کی سرکوبی کی طرف متوجہ فرمایا اور قبلہ پیر صاحب نے حق غلامی ادا کرتے ہوئے مرزائی فتنے کے بخیے ادھیڑ دیئے۔ دجالِ قادیاں مرزا قادیانی سے آپ کے مقابلہ نے ﴿جاء الحق و زھق الباطل﴾ کا عملی نمونہ پیش کیا۔ آپ کی آمد سے مرزا قادیانی چھپ کر اپنے بل میں گھس گیا اور اُسے سامنے آنے کی جراَت نہ ہوئی۔ امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا قادیانی کے واصل جہنم ہونے کی پیش گوئی فرمائی جو 26 مئی 1908ء کو حرف بحرف سچی ہوئی۔

یاد رہے کہ مرزا قادیانی اپنے دشمنوں کو ہیضہ ہونے کی بددعا دیتا تھا کیونکہ وہ اس مرض کو قہر الٰہی کا نشان قرار دیتا تھا۔ اللہ رب العزت کی قدرت کہ خود مرزا قادیانی بھی مہلک قسم کی وبائی ہیضہ میں مبتلا ہو کر واصل جہنم بلکہ اس کے بقول قہر الٰہی کا شکار ہوا۔ مرزائی لٹریچر کے مطابق اس کی موت اس عبرتناک انداز میں ہوئی کہ وہ پاخانہ میں لت پت تھا۔

کذاب قادیاں کو کھڑا کرنے والے کیونکہ انگریز تھے۔ مرزا قادیانی خود تو مر گیا لیکن انگریزوں کی زندگی کے سبب آج بھی یہ فتنہ انہی کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا ہے اور مسلمانوں میں افتراق و انتشار کو پروان چڑھا رہا ہے۔ اس لیے مصور پاکستان علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو اس جملے سے قادیانیت کی حقیقت کو بے نقاب کرنا پڑا کہ ''قادیانیت انگریز کا خود کاشتہ پودا اور یہودیت کا چربہ ہے۔''

انگریزوں ہی کی سرکوبی و سازش کی بدولت 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت متعصب ترین قادیانی سر ظفر اللہ خاں کو نوزائیدہ مملکت پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر کیا گیا جس نے قادیانی نمک کا حق ادا کرتے ہوئے پہلے دن سے ہی اندرون و بیرون

ملک وزارت خارجہ کے تمام اہم عہدوں پر قادیانیوں کو فائز کر دیا۔ اسی سبب قادیانی اس ملک میں بہت جلد قوت میں آگئے حتیٰ کہ صرف قیام پاکستان کے 6 سال بعد یعنی 1953ء میں قادیانی سربراہ مرزا بشیر الدین محمود برسر عام کہنا شروع ہو گیا کہ پھل پک چکا ہے۔ عنقریب بلوچستان پر آپ لوگ قادیانیت کا پرچم لہراتا دیکھیں گے۔

مرزائیوں کی ان سازشوں اور چالبازیوں کا غیور اہل ایمان نے جب بھرپور نوٹس لیا تو حکومت میں موجود قادیانیوں سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ چنانچہ ایک منظم سازش کے تحت مسلمانوں کے پُرامن احتجاج میں تشدد کا عنصر شامل کروایا گیا اور حکومتی مشینری اور اہل اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا گیا۔

ان مشکل ترین حالات میں بھی اس وقت علماء و مشائخ اہلسنت نے بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے مظاہروں اور احتجاج کو پُرامن رکھا لیکن حکومتی حلقوں میں موجود قادیانی دماغوں کو یہ برداشت نہ ہوا اور انھوں نے قائدین کو گرفتار کر لیا۔ چنانچہ اس کے بعد حکومت میں موجود قادیانیوں کی سازش سے یہ تحریک تشدد کی راہ پر چل نکلی۔

اس وقت مسجد وزیر خاں لاہور اس تحریک کا مرکز تھی۔ خلیفۂ اعلیٰ حضرت مولانا سید ابوالحسنات قادری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر قائدین کی گرفتاری کے بعد مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے تحریک کی قیادت فرما رہے تھے۔ دوسری طرف حکومت نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور پریس میں ختم نبوت کا لفظ تک شائع ہونے پر پابندیاں لگا دیں۔

تحریک ختم نبوت 1953ء کے دوران مسلمانوں کے مطالبات یہ تھے کہ (01) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ (02) تمام کلیدی عہدوں سے قادیانیوں کو فی الفور برطرف کیا جائے۔ (03) ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے۔

اہل اسلام کے ان جائز و بنیادی مطالبات کے جواب میں جنرل اعظم خان (مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر) اور چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر موجود متعصب قادیانی میجر جنرل احیاء الدین اور قادیانی جماعت نے دل کھول کر اہل اسلام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔ لاہور کی گلیوں اور سڑکوں کو مجاہدین ختم نبوت کے مقدس خون سے

سرخ کر دیا گیا۔ وحشیانہ و خوفناک تشدد سے تحریک کا گلہ دبانے کی کوشش کی گئی۔ انتظامیہ اور فوج کی پالیسی نے پورے ملک میں کم وبیش دس ہزار مسلمانوں کو شہید کر کے قادیانیوں کے قلب وجگر کو ٹھنڈا کیا۔

مرکزی حکومت میں وزارتِ دفاع کا سیکرٹری سکندر مرزا تو مسلمانوں کے خون کا اس قدر پیاسا تھا کہ جنرل اعظم خان کو کہتا "مجھے یہ نہ بتاؤ کہ فلاں جگہ ہنگامہ ختم ہو گیا یا مظاہرہ ختم ہو گیا بلکہ مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں کتنی لاشیں بچھائی ہیں اور کوئی گولی بیکار تو نہیں گئی؟"

اللہ رب العزت کی قدرت کہ 1953ء کے 10 ہزار شہداء ختم نبوت کا خون 1974ء میں رنگ لے آیا۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ 29 مئی 1974ء کو ربوہ (چناب نگر) ریلوے اسٹیشن پر جناب ایکسپریس کے ذریعے سفر کرنے والے ملتان نشتر میڈیکل کالج کے طلباء پر مرزا طاہر قادیانی کی قیادت میں قادیانی غنڈوں نے حملہ کر دیا اور طلباء پر بہیمانہ تشدد کیا۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پورے ملک میں اس پر صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ ہر طرف سے صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ طلباء پر تشدد کرنے والوں کو قانون و انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت کے ذمہ داروں کے کام پر جوں تک نہ رینگی۔ بالآخر احتجاجی جلسے اور جلوس ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے اور ہر طرف سے قادیانیوں کی غیر آئینی سرگرمیوں کو لگام دینے کا مطالبہ ہونے لگا۔

قائد ملت اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ اس وقت قومی اسمبلی کے رکن تھے۔ آپ نے قومی اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے قرارداد پیش کر دی۔ جس پر اس وقت کی تقریباً تمام اپوزیشن جماعتوں کے دستخط تھے۔ پہلے تو بھٹو حکومت اس معاملہ کو طول دے کر ٹرخاتی رہی لیکن جب اسے پورے ملک میں اس مطالبے کی حمایت میں مسلمانوں کی توانا اور ایک آواز کا احساس ہوا تو آخر کار مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بھی اس معاملہ کو اسمبلی کے ذریعے حل کرنے پر آمادہ ہوئے اور وفاقی وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے حکومت کی جانب سے بھی اس حوالے سے

قرارداد جمع کروادی۔

بھٹو نے کئی مرتبہ مولانا نورانی سے کہا مولانا آپ نے یہ کیا دارالعلوم اور مسجد کی بحث کو اسمبلی میں گھسیٹ لیا ہے۔ جب مساجد اور دارالعلوم سے انھیں کافر قرار دیا جا رہا ہے تو اسمبلی میں اس بحث کو کیوں لائے ہیں؟

مولانا نورانی ہر بار اس سوال کا بڑے تحمل سے جواب دیتے کہ بے شک یہ دارالعلوم اور مساجد کی بحث ہے اور انھوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم ہی قرار دیا ہے لیکن پارلیمنٹ بھی تو مسلمانوں کی ہے۔ اس فورم سے بھی قادیانیوں کی آئینی اور قانونی حیثیت کا تعین ضروری ہے۔

بہرکیف اس وقت کے اخبارات و جرائد نے بھی تحریک کی آواز کو ملک گیر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا نورانی دن کو اسمبلی ہاؤس میں رات کو عوامی جلسوں میں اس تحریک کی قیادت کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

جب یہ مسئلہ قومی اسمبلی میں باقاعدہ پیش ہوا تو قادیانیوں کے ربوائی گروپ اور لاہوری گروپ کی طرف سے اسپیکر اسمبلی کو یہ درخواست موصول ہوئی کہ اگر ممبران اسمبلی ہماری مذہبی حیثیت کا تعین کرنا ہی چاہتے ہیں تو انھیں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ہمیں بھی ضرور سننا چاہیے وگرنہ ان کا کوئی بھی فیصلہ یک طرفہ ہوگا۔ اس بات کا سپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان نے جب محترم قائد اہلسنت سے تذکرہ کیا تو آپ نے پوری جرأت و بہادری سے فرمایا: جناب اسپیکر! اگر وہ ایسا چاہتے ہیں تو اُن کا شوق پورا کردیں اور انھیں بھی ضرور بلائیں۔

چنانچہ طے شدہ طریقہ کار کے مطابق تمام اراکین اسمبلی کو خصوصی کمیٹی قرار دیا گیا اور اسپیکر چیئرمین قرار پائے۔ تمام اراکین اسمبلی اپنے اپنے سوالات لکھ کر اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار صاحب کو دے دیتے اور وہ انھیں موقع بہ موقع حسب ضرورت ربوائی گروپ کے سربراہ مرزا ناصر اور لاہوری گروپ کے سربراہ صدرالدین لاہوری کے سامنے پیش کردیتے اور پھر ان پر جرح ہوتی۔ 11 دن مرزا ناصر اور 2 دن صدرالدین پر جرح ہوئی۔

آخرکار 90 روز کی شب و روز محنت و کاوشوں سے تمام اراکین اسمبلی کے سامنے قادیانیوں کے دونوں گروہوں کا کفر طشت از بام ہوگیا اور ستمبر 1974ء کو قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر آئین میں حسب ضرورت ترمیم کردی۔

الحمدللہ یوں دجالِ قادیاں مرزا قادیانی کے 90 سالہ فتنہ کو آئینی نکیل ڈالی گئی اور مسلمانوں کا دیرینہ مطالبہ پورا ہوا۔ اب پاکستان کی مسجد کے منبر و محراب ہوں یا دارالعلوم کے دارالافتاء، لوئر کورٹ ہوں یا سپریم کوٹ، پاکستان کی عدالتیں ہوں یا جنوبی افریقہ کی صوبائی اسمبلیاں ہوں یا قومی اسمبلی ہر طرف سے یہی صدا آتی ہے کہ قادیانی دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔

یہ نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت کا فیضان ہی تھا کہ اس مسئلہ پر پاکستان بھر کے تمام طبقات کی آواز ہوگئے اور ہر طرف سے تاجدارِ ختم نبوت زندہ باد، مرزائیت مردہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔

دجل و فریب، قادیانیت کا دوسرا نام ہے۔ قادیانی آئینی طور پر تو غیر مسلم قرار پائے تھے لیکن وہ شعائر اسلامی کا استعمال کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے کفر و ارتداد کے جال میں بہت آسانی سے پھنسا لیتے ہیں۔ آخرکار اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں اس موڑ پر بھی ناکام و نامراد فرمایا۔ وہ یوں کہ 26 اپریل 1984ء کو حکومت وقت نے امتناعِ قادیئیت آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے قادیانیوں کو شعائر اسلامی کے استعمال سے روک دیا گیا یعنی قانونی طور پر قادیانی خود کو مسلمان کہلوانے، اپنی عبادت گاہ کو مسجد اور پکار وغیرہ کو اذان نہیں کہہ سکتے نیز ان کی تبلیغی وارتدادی سرگرمیوں پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

1951ء کے اواخر ہی میں مرزائیوں کے اخبار ''الفضل'' (ربوہ) نے مرزا بشیر الدین محمود کی نہایت اشتعال انگیز تقریروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ سر ظفر اللہ کے وزیر ہونے کے باعث مرزائی اپنے آپ کو بہت زیادہ طاقتور تصور کرنے لگے تھے اور وہ غالباً اس زعم میں بھی مبتلا ہو چکے تھے کہ پاکستان میں اُن کے ناپاک عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی مؤثر قوت موجود نہیں ہے۔

چنانچہ ''الفضل'' نے سرخیاں جمائیں ''جب تک اپنے دشمنوں کو قدموں پر نہ جھکا لو چین سے نہ بیٹھو۔ ہمارے پاس عسکری قوت موجود ہے''۔ 1953ء گزرنے نہ پائے گا کہ ہم اپنے مخالفین کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ہمارے قدموں پر آ کر گریں وغیرہ وغیرہ۔

ان اشتعال انگیز تحریروں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا اور اُن کے سینوں میں ایک لاوا سا پکنے لگا جو ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ مختلف شہروں سے علماء کرام اور دیگر حضرات وفود کی صورت میں میرے والد محترم مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور انھوں نے مرزائیوں کے خلاف تحریک چلانے کا مطالبہ کیا۔ علماء اہل سنت کے علاوہ دیگر مکاتب فکر کے علماء مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے قبلہ والد صاحب کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ وہ مرزائیوں کے خلاف تحریک کی قیادت کریں۔

یہ سب حضرات اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ والد محترم قبلہ سید صاحب کے تحریک پاکستان میں مجاہدانہ کردار اور دیگر قومی و ملی خدمات کے باعث ان کا سوادِ اعظم میں بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے۔ چنانچہ تمام مکاتب فکر کے زعماء نے ان سے تحریک ختم نبوت کی قیادت قبول کر لینے پر اصرار کیا اور پھر برکت علی محمڈن ہال میں ایک عظیم الشان کنونشن کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء شریک ہوئے۔ اس موقع پر جلسہ کی صدارت پیر صاحبزادہ سید غلام محی الدین گولڑوی المعروف بابو جی رحمۃ

اللہ علیہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ گولڑہ شریف نے فرمائی جو مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار عوامی اجتماع میں تشریف لائے تھے۔ تونسہ شریف اور علی پور شریف کے سجادہ نشین حضرات سمیت ملک بھر سے جید مشائخ اس کنونشن میں شریک ہوئے۔

اس کنونشن میں یہ طے پایا کہ تمام مکاتب فکر کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس عمل تشکیل دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر تمام جماعتوں نے علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کو صدر منتخب کیا اور سید داؤد غزنوی کو جنرل سیکرٹری کے فرائض سونپے گئے جبکہ دیگر سرکردہ حضرات میں سید عطاء اللہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین اور صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ (آلومہار شریف) شامل تھے۔

مجلس عمل میں جمعیت علماء پاکستان کے مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین، اہل حدیث کے مولانا اسماعیل اور مولانا عطاء اللہ حنیف جماعتِ اسلامی کے میاں طفیل محمد، امین احسن اصلاحی اور نصر اللہ خان عزیز جمعیت علماء اسلام کے مولانا احمد علی لاہوری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے مولانا حسین اختر اور مولانا محمد علی جالندھری شامل تھے۔

مرکزی تنظیم کے قیام کے بعد صوبائی اور ضلعی کمیٹیاں بنا دی گئیں اور مختلف مقامات پر کنونشوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کنونشوں میں جو تین مطالبات حکومت کے سامنے رکھے گئے ان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے، ظفر اللہ سمیت تمام قادیانیوں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹانے اور ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے پر زور دیا گیا تھا۔ پنجاب اور ملک کے دوسرے صوبوں میں جلسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

1952ء میں مرکزی انجمن حزب الاحناف کا سالانہ اجلاس مسجد وزیر خاں لاہور میں شروع ہوا نماز جمعہ کے بعد پہلی نشست سے حضرت علامہ سید ابوالحسنات نے خطاب کرنا تھا۔ لیکن چند گھنٹے قبل اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب ممتاز دولتانہ نے دفعہ 144 کے تحت جلسوں وغیرہ پر پابندی عائد کروا دی۔ حضرت علامہ سید ابوالحسنات نے دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تقریر کی اور انھوں نے دولتانہ کو چیلنج کیا کہ وہ ختم نبوت کے حق میں آواز کو نہیں روک سکتے۔

انھوں نے نہایت پرجوش انداز میں فرمایا اگرچہ دولتانہ تحریک پاکستان میں ہمارے ہم سفر رہے ہیں۔ لیکن آج کلمۂ حق بلند کرنے کے جرم میں وہ ہمیں بخوشی گرفتار کر سکتے ہیں۔ ہم پاکستان کی بقاء اور استحکام کے لیے تحریک ختم نبوت کو جاری رکھیں گے۔

دفعہ 144 کی کھلی خلاف ورزی کے باوجود انھیں گرفتار نہ کیا گیا اور سہ روزہ اجلاس بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد تحریک چلتی رہی اور اجتماعی جلسوں کا سلسلہ جاری رہا۔

1953ء کے اوائل میں مجلس عمل نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد کی صورت میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان سے ملا جائے اور انھیں اپنے مطالبات اور ملکی صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ علامہ سید ابوالحسنات کی قیادت میں ایک وفد ترتیب دیا گیا جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سید داؤد غزنوی، صاحبزادہ سید فیض الحسن، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، سید مظفر علی شمسی اور مولانا محسن فقیہ شافعی شامل تھے۔

یہ وفد کراچی پہنچا اور وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے قوم کے مطالبات ان کے سامنے رکھے۔ خواجہ صاحب نے مطالبات سننے کے بعد کہا ''میرے لیے ان مطالبات کو مان لینا بہت مشکل ہے کیونکہ اگر میں سر ظفر اللہ کو کیبنٹ (کابینہ) سے نکال دوں تو امریکہ ناراض ہو جائے گا اور جو امداد پاکستان کو مل رہی ہے وہ بند ہو جائے گی۔''

قائد وفد علامہ ابوالحسنات نے جواباً فرمایا: ''ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کا ناصر اور رازق اللہ تعالیٰ ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ سب کچھ امریکہ کو سمجھتے ہیں۔ حکومت کو ہمارے مطالبات بہر حال منظور کرنا ہوں گے ورنہ ہمیں موجودہ تحریک کو ڈائریکٹ ایکشن کی طرف لے جانا پڑے گا۔ ہاں البتہ ہم آپ کو سوچنے کے لیے وقت دینے کو تیار ہیں اس وقت تک ہم تحریک کو نرم رکھ سکتے ہیں۔''

لیکن وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس

نے واضح طور پر مطالبات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد کراچی ہی میں مجلس عمل کا ایک اجلاس بلایا گیا جس میں متذکرہ وفد کے ارکان کے علاوہ جماعت اسلامی کے بانی مودودی اور احتشام الحق تھانوی بھی شامل تھے۔ اس اجلاس کی کئی نشستیں ہوئیں اور آخری نشست میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا گیا۔

26 فروری 1953ء کی شام کو نشتر پارک کراچی میں جلسہ عام کا اعلان کیا گیا۔ مولانا مودودی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط کرنے کے بعد لاہور واپس آگئے اور 26 فروری کی شام کو پروگرام کے مطابق نشتر پارک میں عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں مولانا مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے علاوہ باقی تمام اکابرین نے تقاریر کیں۔

26 اور 27 کی درمیانی شب کو جلسہ سے فارغ ہونے ے بعد یہ حضرات جب واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ 27 فروری کو جمعہ کے روز اکابرین کی گرفتاریوں کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ مشتعل ہو کر سڑکوں پر نکل آئے۔

لاہور میں دہلی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑا اجتماع ہوا۔ مشتعل ہجوم نے مرزائیوں کے اداروں اور ان کے مکانوں کو آگ لگانے کا پروگرام بنایا۔ نمازِ جمعہ ادا کرے کے بعد میں مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کے ہمراہ اجتماع میں پہنچا اور ہم نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اعلیٰ سطح کی میٹنگ کے فیصلے کا انتظار کریں۔

27 اور 28 فروری کی درمیانی شب مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے روز 28 فروری کو صبح 9 بجے کے قریب میں مودودی سے ملاقات کر کے صورت حال کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے ان کی اقامت گاہ پر پہنچا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اس موقع پر موجود تھے۔

مولانا مودودی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے فرمایا: ”مولانا احتشام الحق تھانوی کا رات ٹیلی فون آیا تھا۔ ڈائریکٹ ایکشن کی تجویز سے انھیں اور مجھے اتفاق نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے فیصلہ

کیا ہے کہ ہم تحریک میں حصہ نہ لیں۔"

میں نے عرض کی آپ کے تو دستخط موجود ہیں پھر یہ فیصلہ کیسا؟ مولانا نے جواباً فرمایا وہ میٹنگ کا فیصلہ تھا اب صورت مختلف ہے۔ بہر حال میں تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا۔

مولانا عبدالستار خان نیازی نے اس موقع پر ان سے کہا لوگ اس وقت بہت مشتعل ہیں اور وہ جذبات میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں، کوئی ان کی قیادت کرنے والا نہیں۔ آپ مجلس عمل کے رکن ہیں اگر اب آپ آگے نہیں آنا چاہتے تو ہمیں اختیار دیجیے تاکہ ہم تحریک چلا سکیں۔

مولانا مودودی ہمیں تحریری طور پر اختیارات دینے پر رضامند ہو گئے۔ مولانا داؤد غزنوی دل کے عارضہ میں مبتلا تھے انھوں نے بھی ہمیں اختیارات لکھ کر دے دیئے۔ اس کے بعد میں مولانا احمد علی لاہوری کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا "میرا بستر بندھا ہوا رکھا ہے۔ مولانا ابوالحسنات میرے صدر ہیں۔ میں نے انھیں خط روانہ کر دیا ہے۔ ان کا جواب ملنے پر میں ان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اس کے جواب میں، میں نے کہا مولانا ابوالحسنات تو اس وقت جیل میں ہیں نہ آپ کا تار انہیں پہنچے گا اور نہ ان کا جواب آپ کو ملے گا۔ لہٰذا اگر بان مقصود ہے پھر تو الگ بات ہے۔ اگر آپ کا ارادہ عملاً حصہ لینے کا ہے تو آپ وعدہ فرمائیے۔ انھوں نے کہا میں تیار ہوں جو حکم مجھے دیا جائے گا اس کی تعمیل کروں گا۔

اس کے بعد میں مفتی محمد حسن امرتسری (بانی جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور) کے پاس گیا تو انھوں نے اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا میں ٹانگوں سے معذور ہوں اس لیے عملاً حصہ نہیں لے سکتا۔ میں نے ان سے کہا۔ جناب آپ معذور ضرور ہیں لیکن قیامت کے دن میرے آقا گنبد خضریٰ کے مکین حوض کوثر پر جلوہ افروز ہوں گے اور آپ سے فرمائیں گے کہ میرے نام پر کھاتے رہے عزت کرواتے رہے اور مفتی کہلواتے رہے۔ لیکن میری ناموس کا مسئلہ آیا تو معذوری ظاہر کر دی۔ اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ یہ سن کر مفتی صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ انھوں نے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر چوما اور

پھر کہنے لگے۔ آپ مجھے جب چاہیں گرفتار کروا دیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

اس گفتگو کے بعد میں وہاں سے دہلی دروازہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ تقریب ایک لاکھ افراد کا جم غفیر موجود تھا اور لوگ منتظر تھے کہ کوئی انھیں پروگرام بتائے۔ میں وہاں سے فوراً مولانا غلام دین صاحب خطیب انجن شیڈ کے پاس پہنچا۔ اس وقت ظہر کا وقت تھا اور مولانا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ مولانا آپ کو آج ہی اور اسی وقت گرفتاری پیش کرنا ہے۔ مولانا نے بلا حیل و حجت فرمایا۔ نماز پڑھ لوں یا پہلے چلوں؟ میں نے عرض کی۔ وہاں لوگ منتظر ہیں۔ نماز آپ وہیں پڑھیں اور تقریر کے بعد جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چیئرنگ کراس (مال روڈ) پہنچ کر گرفتاری دیں۔

مولانا نے گھر پر اطلاع دے دی اور فوراً میرے ساتھ دہلی دروازہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے نماز ظہر پڑھائی اور ایک نہایت ایمان افروز تقریر فرمائی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک عظیم الشان جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چیئرنگ کراس پہنچ کر گرفتاری دے دی۔

اسی روز شام کو مسجد وزیر خان میں رضا کاروں کا اجتماع شروع ہو گیا۔ میں بھی بستر لے کر مسجد وزیر خاں پہنچ گیا۔ اس کے بعد پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا کہ صبح 10 بجے مسجد وزیر خاں میں اجلاس ہوتا اور 10 رضا کار جلوس کے ساتھ گرفتاریاں پیش کرتے۔ نماز ظہر کے بعد دہلی دروازہ کے باغ سے (جو اس وقت اکبری دروازہ تک پھیلا ہوا تھا) 10 رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے۔ روزانہ گرفتاریاں پیش کرنے والوں کی قیادت کوئی ایک عالم دین کرتا تھا۔

مولانا عبدالستار خاں نیازی اور مولانا بہاء الحق قاسمی بھی میرے ساتھ مسجد وزیر خاں میں تھے۔ 29 فروری کو مولانا احمد علی لاہوری نے دہلی دروازہ کے اجلاس میں تقریر کر کے گرفتاری پیش کی۔

مولانا ظفر علی خاں کے صاحبزادے اور اخبار ''زمیندار'' کے ایڈیٹر اختر علی

خاں (جو کہ مجلس عمل کے خازن بھی تھے) نے پہلے تو تحریک کی پر زور حمایت کی لیکن جب دولتانہ وزارت کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا گیا تو ان کا رویہ بدل گیا۔ عوام نے ''زمیندار'' کی کاپیاں جلا کر احتجاج کیا اور پھر 36 فروری کو شام کو مشتعل ہجوم نے ان کا گھیراؤ کر لیا۔ انھوں نے جان بچانے کے لیے برقعہ پہنا اور گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر مسجد وزیر خاں پہنچ گئے اور اگلے روز انھوں نے بھی تقریر کر کے گرفتاری پیش کر دی۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں رضا کاروں کا ایک جلوس دہلی دروازے سے حسب معمول نکلا اور جب یہ جلوس برانڈرتھ روڈ پہنچا تو پولیس نے بلا جواز سخت تشدد کیا جس کے باعث بہت سے رضا کار شدید زخمی ہو گئے۔ ہم نے مسجد وزیر خاں میں ڈسپنسری کا انتظام پہلے سے ہی کر رکھا تھا چنانچہ ان کا علاج شروع ہو گیا۔

اسی دوران شہر میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ ڈی ایس پی فردوس شاہ نے قرآن پاک کی توہین کی ہے۔ چنانچہ اگلے روز ظہر کے اجلاس میں ایک صاحب نے مجمع عام میں قرآن پاک کے پھٹے ہوئے اوراق پیش کیے جس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور ان کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ چوک وزیر خاں کے قریب پولیس کا ایک سپاہی کشمیری بازار کی طرف سے آ رہا تھا لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے جان بچانے کے لیے ایک قریبی مکان میں پناہ لی۔ جب وہ کھڑکی سے سر باہر نکالتا تو لوگ نعرے لگاتے۔ یہ خبر ڈی ایس پی تک پہنچی تو وہ اس سپاہی کو بچانے کے لیے ایک گارڈ کے ہمراہ چوک وزیر خاں کی طرف چلا اور پھر اس کا ایک مشتعل جلوس سے آمنا سامنا ہو گیا۔

درحقیقت یہ ساری واردات حکومت نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت کروائی تھی کیونکہ دولتانہ وزارت چاہتی تھی کہ اسے تشدد کا کوئی بہانہ ہاتھ آئے تا کہ تحریک کو کچلا جا سکے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد وسیع پیمانے پر تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور رات بھر گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ فردوس شاہ کے قتل کے بعد کرفیو لگا دیا گیا تھا لیکن ہم نے مسجد وزیر خاں کا اجلاس جاری رکھنے اور بدستور گرفتاریاں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسی روز مولانا غلام محمد ترنم، مولانا غلام دین، حافظ خادم حسین اور احمد علی لاہوری کو ہتھکڑیاں لگا کر لاہور سے ملتان لے جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر لایا گیا، جس سے عوام کا اشتعال اور زیادہ بڑھا۔ رات کو مسجد وزیر خاں میں میری صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کی اشتعالی کارروائیوں کی مذمت کی گئی۔

تحریک کی نظامت اس وقت میرے پاس تھی۔ حکومت کے کچھ نمائندے میرے پاس آئے اور انھوں نے دوران گفتگو بتایا کہ دولتانہ حکومت نے آپ کے مطالبات منظور کر لیے ہیں اس لیے تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیں۔ میں نے جواباً انھیں یہ بتایا کہ تحریک کی باگ ڈور اور اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار ان لوگوں کے پاس ہے جو کراچی اور سکھر جیل میں محصور ہیں لہٰذا آپ ان سے رابطہ قائم کیجیے۔ اگر انھوں نے ہمیں تحریک ختم کرنے کا حکم دیا تو ہم کوئی پس و پیش نہیں کریں گے۔ بصورت دیگر ہم پوری قوت کے ساتھ مطالبات منوانے کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اس کے بعد حکومت کے نمائندے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

3 مارچ کو مسجد وزیر خاں میں مسلم لیگ کی کچھ خواتین آئیں۔ انھیں بھی دراصل ایک سازش کے تحت بھیجا گیا تھا کہ کوئی ہنگامہ آرائی ہو اور تشدد کرنے کا بہانہ ہاتھ آ سکے۔ لیکن ہم نے عوام پر کنٹرول کرتے ہوئے ان خواتین کو مسجد سے محفوظ جگہ تک پہنچا دیا اور اس طرح حکومت کی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔

مسجد وزیر خاں میں ہر روز بعد نماز عشاء بھی جلسہ عام کا اہتمام ہوتا تھا جس میں بڑی ایمان افروز تقاریر ہوتیں۔ 5 مارچ تک تحریک نے پورے پنجاب میں زور پکڑ لیا تھا۔ سندھ اور سرحد میں بھی ہنگاموں کا سلسلہ جاری تھا۔ 4 مارچ 1953ء سارا دن گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ جس مکان سے ختم نبوت کی آواز بلند ہوتی اس کے مکینوں کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔

4 مارچ کی رات کو مسجد وزیر خاں کے اجلاس میں ہم نے پہیہ جام ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ انتہائی مختصر نوٹس کے باوجود اس اپیل کے نتیجے میں اگلے روز ایسی شاندار

ہڑتال ہوئی کہ اس کی مثال نہیں ملتی حتیٰ کہ اخبارات میں خبر پڑنے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس سیکرٹریٹ کے سرکاری ملازمین نے بھی قلم چھوڑ دیئے۔ کسی بس یا ٹرک کا تو ذکر ہی کیا تانگہ یا رکشہ تک نظر نہ آتے تھے۔ غرضیکہ اس ہڑتال نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

5 مارچ کی شام کو پورے ملک میں ایک عجیب سناٹا تھا عورتیں بچے بوڑھے بھی میدان میں نکل آئے تھے۔ سیالکوٹ گوجرانوالہ راولپنڈی اور سندھ کے بہت سے علاقوں میں تھانوں پر شمع ختم نبوت کے پروانوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ دولتانہ کی صوبائی اور خواجہ ناظم الدین کی مرکزی حکومت بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

اسی روز پولیس نے دہلی دروازے کے اجلاس پر پابندی عائد کردی اور لوگوں کو اس میں شرکت سے روکا۔ جب پولیس کو کامیابی نظر نہ آئی تو اس نے گولی چلا دی۔ اس موقع پر محمد عربی ﷺ کے غلاموں نے سینے تان کر گولیاں کھائیں اور جام شہادت نوش کیا۔

مسجد وزیر خاں زخمیوں اور شہداء سے بھر چکی تھی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہداء کے کفن و دفن کا انتظام بڑی سرگرمی سے جاری تھا۔ ایک عجب منظر تھا ہر طرف خون میں نہائے ہوئے نوجوان لیٹے تھے۔ اس موقع پر عوام کے تعاون کا یہ عالم تھا کہ خوراک اور مالی امداد سمیت جس چیز کی بھی اپیل کی جاتی فوراً مہیا ہو جاتی۔

زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کے لیے کثیر تعداد میں ڈاکٹر اور ڈسپنسر پہنچ چکے تھے اور انھوں نے رضا کارانہ طور پر تمام خدمات انجام دیں۔ اس روز تقریباً چالیس مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا اور سینکڑوں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ شہداء کو تدفین کے لیے جلوس کی شکل میں میانی صاحب قبرستان اور دیگر قبرستانوں میں لے جایا گیا۔

وہ شہدا کی قبریں سنہری مسجد کشمیری بازار کے عقب میں بنا دیں گئیں۔ اس وقت ملت اسلامیہ کے جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ انھیں مرنے مارنے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا، ہماری طرف سے لوگوں کو پُرامن طور پر احتجاج کرنے کی اپیلیں مسلسل جاری کی جارہی تھیں۔

دولتانہ وزارت نے اس موقع پر ایک اور چال چلی کہ ہوائی جہاز کے ذریعے اشتہارات پھلکے کہ حکومت نے مطالبات منظور کر لیے ہیں اور تحریک ختم ہوگئی ہے لیکن یہ چال بھی کامیاب نہ ہوسکی اور عوام حکومت کے ہتھکنڈے فوراً سمجھ گئے۔

6 مارچ کو جنرل اعظم کی قیادت میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ یہ مارشل لاء انتہائی سخت تھا۔ ریڈیو سے دھمکی آمیز اعلانات نشر ہو رہے تھے۔ دن کے بارہ بجے ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا خلیل احمد قادری اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں ورنہ انھیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے گی۔

مولانا عبدالستار خان نیازی اس وقت صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے اور ہماری خواہش تھی کہ وہ اس مسئلہ پر پنجاب اسمبلی میں تقریر کریں۔ اسمبلی کا اجلاس چند روز میں شروع ہونے والا تھا چنانچہ ہم نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں۔ مولانا نیازی نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور آپ چند افراد کے ہمراہ مسجد کے مغربی اور جنوبی مینارہ سے متصل مکان میں منتقل ہوئے اور پھر دیہاتیوں کا سا لباس پہن کر لاہور سے باہر چلے گئے۔ اس موقع پر تحریک دشمن عناصر نے یہ افواہیں پھیلائیں کہ مولانا نیازی دیگ میں بیٹھ کر گئے ہیں اور انھوں نے داڑھی منڈوالی ہے۔ یہ افواہیں صرف تحریک کو ناکام بنانے کے لیے پھیلائی گئیں اور پولیس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے انھیں ہوا دی حالانکہ ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

6 مارچ کو مسجد وزیر خاں میں تقریباً تین چار ہزار رضا کار موجود تھے۔ مسجد میں پروگرام کے مطابق اجلاس ہوتے رہے اور پانچ چھ رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے رہے۔

7 مارچ کو ظہر کے بعد مسجد میں اجلاس ہو رہا تھا اور رضا کار جلوس کی تیاری کر رہے تھے کہ مسجد سے متصل سڑک پر جنرل محمد ایوب خاں (جو بعد میں سربراہ مملکت بھی بنے) چند دیگر فوجی افسران کے ہمراہ آئے اور انھوں نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کیا کہ مولانا خلیل احمد قادری اور مسجد کے اندر موجود تمام رضا کار خود کو گرفتاری کے لیے

پیش کر دیں ورنہ ہم انھیں مسجد کے اندر داخل ہو کر گرفتار کر لیں گے۔ اس طرح جو کشت وخون ہوگا اس کی ذمہ داری انہی افراد پر ہوگی۔

اس کے جواب میں، میں نے لاؤڈر سپیکر پر تقریر کی اور امام ابو یوسف کا ایک واقعہ پیش کیا کہ جب بادشاہ وقت نے اپنی بیگم زبیدہ کو ان الفاظ میں مشروط طلاق دی کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میری سلطنت سے باہر چلی جاؤ ورنہ تم پر میری طلاق ہو جائے گی۔ غصے کے عالم میں بادشاہ نے یہ بات کہہ دی لیکن جب غصہ ختم ہوا تو وہ پریشان ہوگیا اور اس نے علماء سے فتوی پوچھا۔ علماء نے جواب دیا کہ حدود سلطنت سے نکلنا لازم ہے ورنہ طلاق ہو جائے گی۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ نے سارا واقعہ سننے کے بعد فرمایا کہ: بادشاہ سے کہو وہ بے فکر ہو جائے سورج غروب ہونے سے پہلے اس کی بیگم اس کی حدود سے نکل جائے گی اور یہ شرط پوری ہو جانے کے بعد طلاق نہیں ہوگی۔ سورج غروب ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تو بادشاہ بہت گھبرایا اور اس نے اپنے نمائندہ دوبارہ امام صاحب کی خدمت میں بھیجے۔

آپ نے فرمایا کہ بیگم کو مسجد میں لے آؤ اور علماء سے پوچھ لو کہ مسجد بادشاہ کی مملکت سے باہر ہے یا نہیں؟ چنانچہ بیگم کو مسجد میں لایا گیا اور تمام علماء نے بالاتفاق یہ فیصلہ دے دیا کہ مسجد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی مملکت نہیں ہے اور اس طرح طلاق نہیں ہوئی۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد میں نے کہا مسجد خانہ خدا ہے۔ اگر مارشل لاء حکام نے مسجد میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو اس کا بڑی سختی سے جواب یا جائے گا اور تمام تر ذمہ داری فوجیوں پر عائد ہوگی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ فوج اور پولیس کو مسلمانوں پر گولیاں چلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کے بعد خدا کے فضل وکرم سے فوجی افسران کسی کارروائی کے بغیر ہی واپس چلے گئے۔

اس موقع پر یہ بات بھی سننے میں آئی کہ ایک مرزائی فوجی افسر نے مسجد کو

ڈائنامائیٹ سے اڑا دینے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن وہ ناکام رہا یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا۔

اس روز بھی حسب معمول جلسہ ہوا اور رضا کاروں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ ریڈیو اور اخبارات پر حکومت کا مکمل کنٹرول تھا جہاں سے ہمارے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔ اس موقع پر مولانا سید محمود احمد رضوی (لاہور) اور ان کے رفقاء نے تحریک کی حمایت میں اشتہارات سائیکلو ٹائل کر کے شہر کے مختلف حصوں میں لگانے کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی۔ حکومت نے مسجد وزیر خاں میں کچھ ایسے افراد بھیج دیئے تھے جو رضا کاروں کے حوصلے پست کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔

8 مارچ کو فجر کی نماز کے بعد جب کرفیو کھلا تو میں نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اعلان کیا کہ ہم لوگ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں لہٰذا جو شخص اپنے دل میں ذرا سی بھی کمزوری محسوس کرتا ہے اسے میری طرف سے اجازت ہے وہ جا سکتا ہے۔

جسے زندگی ہو پیاری وہ یہیں سے لوٹ جائے

میری تقریر کے بعد مسجد میں صرف ڈیڑھ ہزار جانثار رہ گئے اور باقی سب گھروں کو چلے گئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسجد وزیر خاں کی بجلی اور پانی بند کر دیا گیا تھا اور خوراک کے تمام راستے مسدود تھے۔ ہمارے پاس مسجد کے حوض میں پانی کا کافی ذخیرہ موجود تھا چنانچہ یہ خوراک استعمال کی گئی۔

امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ دوپہر کے وقت میرے پاس آئے اور انھوں نے گورنر پنجاب نواب چندریگر کا یہ پیغام مجھے دیا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے مسجد سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور وہ واپس چلے گئے۔

8 مارچ کی شام کو رنگ محل شیرانوالہ گیٹ اور موچی دروازہ سے مسجد تک ریت کی بوریاں چن دی گئیں اور خاردار تار بچھا دی گئی تاکہ نہ تو کوئی مسجد کے اندر آ سکے اور نہ ہی واپس باہر جا سکے۔ مسجد کے شمالی اور مغربی حصے کے مکانات خالی کروا کر ان پر مشین گنیں اور دیگر ہتھیار نصب کر دیئے گئے۔ رات بھر مسجد میں ذکر الٰہی جاری رہا۔ نعرہ

ہائے تکبیر و رسالت اور ختم نبوت زندہ باد کے فلک شگاف نعرے فضاء میں گونجتے رہے۔

9 مارچ کو صبح 10 بجے امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ میرے پاس دوبارہ تشریف لائے۔ موصوف تحریک پاکستان کے رہنما اور قبلہ والد صاحب کے دوست تھے۔ انھوں نے مجھے کہا کہ سارے شہر میں فوج کا کنٹرول ہو چکا ہے۔ اگر آپ نے مزاحمت جاری رکھی تو جانوں کا نقصان ہوگا اور مسجد کی بے حرمتی کا بھی خطرہ ہے۔

قدوائی صاحب سے گفتگو کے بعد میں نے رضا کاروں سے مشورہ کیا تو فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے میں اپنی گرفتاری پیش کر دوں۔ چنانچہ میں گرفتاری پیش کرنے کے لیے قدوائی صاحب کے ہمراہ مسجد کے جنوبی دروازہ سے باہر آیا۔ ایک کرنل، دو سپاہی اور کثیر تعداد میں فوجی باہر موجود تھے۔ انھوں نے پستول اور ریوالور ہماری طرف کر کے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے کہا میں تو خود گرفتاری پیش کر رہا ہوں۔ اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ کرنل نے جواب دیا آپ ہم کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ آپ نے مسجد میں اسلحہ جمع کر رکھا ہے اور میناروں میں پوزیشن لی ہوئی ہے اس لیے یہ کچھ کرنا پڑا۔ میں نے اس کرنل کو کہا اگر آپ مرزائی ہیں تو پھر یقیناً مسلمان نہیں اور اگر مسلمان ہیں تو پھر کسی مسلمان کو غیر مسلم سمجھنا بہت بڑا ظلم ہے۔ رہا مسجد میں پوزیشن سنبھالنے اور اسلحہ جمع کرنے کا سوال تو یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ دروازے کھلے ہیں آپ اندر جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس پر وہ بھی ہنس پڑا اور اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔

قدوائی صاحب بھی میرے ہمراہ تھے۔ کپڑے جو میں نے پہن رکھے تھے کافی پھٹ چکے تھے کیونکہ 28 فروری کو مسجد میں منتقل ہونے کے بعد مجھے گھر جانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ جب مجھے خرادی محلہ کی طرف لایا گیا تو میں نے فوجیوں سے کہا کہ میرا مکان قریب ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کپڑے تبدیل کر لوں؟ کرنل نے رضامندی ظاہر کر دی لیکن جب ہم چند قدم آگے آئے تو کرفیو کے باوجود عورتیں، مرد اور بچے گھروں سے باہر نکل آئے اور انھوں نے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر کرنل نے مجھے کہا۔ اب آپ ہمارے ساتھ چلیں

کپڑے ہم بعد میں آپ کو منگوا دیں گے۔ چوہٹہ مفتی باقر سے ہمیں پرانی کوتوالی لایا گیا یہاں تک ہم پیدل ہی آئے۔ پرانی کوتوالی میں فوجیوں نے بڑے بڑے وائرلیس لگا رکھے تھے۔ انھوں نے وائرلیس پر اپنے ہیڈ کوارٹر اطلاع دی کہ ملزم کو پکڑ لیا گیا ہے اور اسے ہم لے کر آ رہے ہیں۔ پھر ہمیں پرانی کوتوالی سے دہلی دروازے تک پیدل ہی لایا گیا۔

ہمیں زیر حراست دیکھ کر لوگ مکانوں کی چھتوں سے نعرے لگانے لگے۔ دہلی دروازے سے جیپ میں بٹھا کر ہمیں شاہی قلعہ کی طرف لے جایا گیا۔ مارشل لاء حکام کو ہماری گرفتاری کی اطلاع ہو چکی تھی۔

شاہی قلعہ میں داخل ہوئے تو دربار کے بالائی حصے میں تین چار اُونچے قد والے فوجی افسران کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ نیچے آئے، میز اور کرسیاں بچھائی گئیں۔ وہ فوجی افسران کرسیوں پر بیٹھ گئے (غالباً ایک فوجی افسر کا نام سرفراز تھا) مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ قدوائی صاحب میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

ایک فوجی افسر نے سب سے پہلا سوال مجھ پر کیا کہ کیا آپ غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور یہ تحریک کس ملک کے ایماء پر چلائی جا رہی ہے؟ میں نے جواباً کہا۔ 1947ء میں تحریک پاکستان کی حمایت میں خضر وزارت کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہوا تھا کیا وہ بھی غیر ملکی سازش تھی؟ جن لوگوں نے اس تحریک میں گرفتاریاں پیش کیں کیا وہ بھی غیر ملکی ایجنٹ تھے؟ ہماری تحریک تو ان لوگوں کے خلاف ہے جو غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور مذہبی و سیاسی لحاظ سے پاکستان کے دشمن ہیں۔ ان لوگوں نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ تک پڑھنے سے گریز کیا۔ آج یہ لوگ ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز ہو گئے ہیں۔ ہم نے تحریک ان کو کلیدی عہدوں سے علیحدہ کرنے کے لیے چلائی ہے۔

پھر اس فوجی افسر نے دوسرا سوال کیا کہ آپ قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے؟ میں نے جواب دیا ''نہیں''۔ اس نے پوچھا کیوں؟ میں نے جواب دیا: ''سرکارِ دو جہاں ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور قادیانیوں نے ایک بناسپتی نبی پیدا کر لیا

ہے۔ ان کی فقہ بھی مسلمانوں سے علیحدہ ہے۔ ضابطہ اخلاق بھی جدا ہے اور سیاسی نظام بھی مختلف ہے۔ اس نے پوچھا۔ فقہ کیسے علیحدہ ہے؟ میں نے جواباً کہا۔ زانی کو ہم مسلمان قرآنی حکم کے مطابق کوڑوں کی سزا کا حقدار سمجھتے ہیں جبکہ قادیانیوں نے زنا کی سزا دو جوتے مقرر کی ہے جو زانی زانی کو لگاتا ہے۔ اس طرح قادیانیوں نے زنا کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہ جواب سن کر تو وہ آگ بگولہ ہوگیا اور اس نے انگریزی میں گالیاں دینی شروع کر دیں۔

قدوائی صاحب نے اسے ٹوکا تو دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی۔ فوجی افسر نے قدوائی صاحب کو کہا۔ اب تم بھی اپنے آپ کو گرفتار سمجھو میں تمہارے ساتھ نپٹ لوں گا۔ قدوائی صاحب نے اس سے پوچھا۔ کیا آپ قادیانی ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ پورا ملک قادیانیوں کا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

تقریباً ایک بج چکا تھا اور ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی پھر کرسیاں اٹھالی گئیں اور ہم نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف پٹھان فوجی ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ اسی دوران ظہر کا وقت ہوگیا اور ہم نے وضو کے لیے پانی مانگا۔ ہمیں شمالی حصے میں لایا گیا جہاں نلکا لگا ہوا تھا۔ وہاں سے وضو کرنے کے بعد میں نے اذان دی۔ اذان کی آواز سن کر کچھ فوجی اور کچھ رضا کار جو پہلے ہی گرفتار ہو کر آئے ہوئے تھے نماز پڑھنے کے لیے آگئے۔ میں نے امامت کروائی اور سب نے باجماعت نماز ادا کی۔

نماز کے بعد میں نے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی۔ دعا کے بعد فوجی میرے گرد جمع ہوگئے اور انھوں نے مجھ سے گرفتاری کی وجوہات پوچھیں۔ میں نے قادیانیوں کا پول کھولا اور تحریک کا پس منظر بیان کیا۔ میری باتیں سن کر فوجیوں نے اپنی چادریں بچھا دیں اور نہایت محبت کے ساتھ پیش آئے۔

ایک فوجی میس میں گیا اور ہمارے لیے کھانا لے آیا۔ پھر ہم نے نماز عصر بھی اسی طرح باجماعت ادا کی۔ نماز عصر کے بعد پہلے فوجیوں کی ڈیوٹیاں تبدیل کر دی گئیں اور نئے فوجی آگئے۔ انھوں نے پھر ہمیں نیچے بٹھا دیا اور نہایت سختی کا مظاہرہ کیا، ملنے تک کی ممانعت تھی۔ نماز مغرب کا وقت ہوا تو میں نے پھر اسی طرح اذان دی اور

باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد دعا میں مشغول ہوگیا۔ میری دعا سے فوجی بھی بڑے متاثر ہوئے۔ انھوں نے بھی ہم سے سوالات کیے۔ ہم نے تفصیلات بتائیں تو ان کا رویہ فوراً بدل گیا اور وہ بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔

نماز مغرب کے بعد مجھے اور قدوائی صاحب کو جیپ میں بٹھا کر مغربی حصے میں واقع سی آئی اے دفتر میں لایا گیا جہاں ہمارا نہایت تسلی بخش اور غلیظ گالیوں سے استقبال ہوا۔

قدوائی صاحب کو مجھ سے علیحدہ کر دیا گیا اور مجھے اوپر کے حصے میں لے جا کر ایک چھوٹی سی حوالات میں بند کر دیا گیا جس میں پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ رات کو مجھے کھانا بھی نہیں دیا گیا اور میں بھوکا ہی سو گیا۔

حوالات کے قریب کوئی سپاہی نہیں تھا جس سے پانی مانگا جا سکے چنانچہ اگلے روز فجر کے وقت میں نے تیمم کر کے نماز ادا کی اور نماز کے بعد میں نے قدوائی صاحب کی آواز سنی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ نچلے حصے کے حوالات میں ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص ایک کپ چائے اور ایک چھوٹی سی روٹی رکھ کر چلا گیا۔ میں نے اسے غنیمت جان کر ناشتہ کیا۔ دس گیارہ بجے کے قریب سی آئی اے کا ایک افسر آیا اور مجھے حوالات سے نکال کر اپنے دفتر میں لے آیا۔ چھوٹے قد کے اس افسر کا نام غالباً چوہدری اصغر تھا۔ اس نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ درحقیقت مجھے اس وقت مولانا کے متعلق کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔

جب میں کچھ دیر نہ بتا سکا تو اس نے مغلظات بکنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر تو میں خاموشی سے سنتا رہا لیکن پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اسے کہا وہ میرے بزرگوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال نہ کرے وگرنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ یہ بات سننے کے بعد وہ بکتا ہوا چلا گیا اور مجھے دوسری حوالات میں تنہا بند کر دیا۔

شام کے وقت سی آئی اے کا ایک اور افسر آیا۔ اس نے دفتر میں لے جا کر قدرے نرمی سے تحریک کے متعلق سوالات پوچھے جس کے میں نے مناسب جواب

دیئے۔ پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ تقریباً 15 مارچ تک جاری رہا۔ اس دوران مجھے قید تنہائی میں قید رکھا گیا۔ دوپہر اور شام کو دال روٹی دی جاتی۔

ایک روز مجھے جب حوالات میں بند کرنے کے لیے لے جایا گیا تو متصل حوالات میں مفتی محمد حسین نعیمی نظر آئے۔ ہم دور سے ہی ایک دوسرے کو سلام کر سکے، اس سے زیادہ کی اجازت نہ تھی۔

مجھے بعد میں علم ہوا کہ گرفتاری کے اگلے روز ہمارے مکان پر چھاپہ مارا گیا۔ اس زمانہ میں جمعیت علماء پاکستان کا مرکزی دفتر ہمارے گھر میں ہی تھا۔ مرزائیوں کے خلاف سارا لٹریچر، جمعیت کی فائلیں، لاؤڈ اسپیکر، سائیکلو ٹائل مشین اور کئی دوسری چیزیں پولیس نے قبضہ میں لے لیں۔ اس وقت مکان پر مستورات کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ مستورات کو پردے میں کرا دیا گیا اور دفتری سامان کے ساتھ ساتھ گھریلو سامان کی بھی تلاشی لی گئی۔

15 مارچ سے 25 مارچ تک معمول یہ رہا کہ دن کے وقت مجھے قید تنہائی میں رکھا جاتا اور رات کو تقریباً دس گیارہ بجے تیز روشنی میں بٹھا کر نہایت بدتمیزی سے سوالات کیے جاتے۔

اس کے بعد مجھے پریشان کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا، حوالات کی پچھلی طرف ایک کھائی تھی اس میں فائر کیے جاتے اور پھر ایک افسر سپاہیوں سے پوچھتا آج کتنے اتارے؟ سپاہی جواب میں چار یا چھ کہتا اور پھر مجھے کہا جاتا اب آپ کی باری بھی آنے والی ہے۔

پھر پوچھ گچھ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک تہہ خانے میں لے جایا جاتا اور وہاں اوٹ پٹانگ سوالات کر کے پریشان کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اسی دوران ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک روز مجھے تہہ خانے میں اُتارا جا رہا تھا جب تین سیڑھیاں باقی رہ گئیں تو میں نے دیکھا کہ تقریباً ڈیڑھ گز لمبا سانپ پھن پھیلائے فرش پر پڑا ہے۔ میرے ساتھ آنے والے افسر نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے معافی نہ مانگی تو مجھے اس سانپ کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ میں نے اپنے حوصلے کو

قائم رکھا اور معافی مانگنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھے دھکا دینے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ چنانچہ اتفاق یہ ہوا کہ وہ اپنے ہی زور سے نیچے کی طرف لڑھک گیا اور پھر بدحواسی کے عالم میں اوپر کی طرف بھاگ گیا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔

جب مجھے حوالات میں بند کرنے کے لیے پولیس کی بیرک کے سامنے سے گزارا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور پھر جھنڈے کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ میرے ساتھ چلنے والے سپاہیوں نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے انھیں کہا خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ کڑیاں کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں نہیں پہنیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے آج اللہ کے پیارے حبیب، شافع محشر ﷺ کی ناموس اور عظمت کے تحفظ کی خاطر یہ زیور پہنا ہے۔

یہ سن کر وہ سپاہی خاصے متاثر ہوئے اور انھوں نے کہا دل تو ہمارے آپ کے ساتھ میں لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے، ملازمت کا معاملہ ہے۔ میں نے ان سے کہا یزیدی فوج بھی یہی کہتی تھی۔ اگر تم مجھے حق پر سمجھتے ہو تو اس پر عمل کرو، یہ سن کر وہ شرمندہ ہو گئے۔

30 مارچ کو حوالات میں سو رہا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ مغرب کی جانب سے ایک کوا اُڑتا ہوا آ رہا ہے اور اس کے منہ میں ایک چھوٹا سا سانپ ہے۔ یہ کوا اُڑتا ہوا دوسری سمت چلا گیا۔ جب میں بیدار ہوا تو اس خواب کا اثر ذہن پر موجود تھا۔ میں اس خواب کی تعبیر سوچنے لگا۔ چند لمحے بعد ماشکی گھڑے میں پانی ڈالنے کے لیے آیا تو اس نے بتایا کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم ہو گئی ہے۔

یکم اپریل کو ایک افسر نے آ کر مجھ سے کہا کہ آپ کے والد نے معافی مانگ لی ہے اور وہ گھر واپس آ گئے ہیں لہٰذا آپ بھی معافی مانگ لیں۔ میں اس کی چال فوراً سمجھ گیا اور میں نے کہا میں ایک بہادر اور غیور باپ کا بیٹا ہوں آپ غلط بیانی کر رہے ہیں۔ میرے والد ہرگز معافی نہیں مانگ سکتے۔ میرا یہ جواب سن کر وہ ناکام واپس چلا گیا۔

2 اپریل سے اذیت کا سلسلہ بڑھا دیا گیا۔ رات دن مجھے قلعے کے مختلف حصوں میں تبدیل کر دیا جاتا۔ رات کو جگایا جاتا اور تیز روشنی میں بٹھا کر افسر سوال کرتا۔ ابھی میں اس کا جواب دینے نہ پاتا کہ دوسرا سوال کر دیا جاتا۔

حوالات کے دروازے پر رائفل بردار فوجی ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اگر میں ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ گردن ہلا کر معذرت کا اظہار کر دیتے تھے۔ ماشکی گھڑے میں پانی لا کر ڈالتا اور خاموشی سے واپس چلا جاتا۔ گویا وہ ماحول (صم بکم عمی فھم لا یرجعون) کا سا تھا لیکن حوصلہ اور ہمت اس لیے بلند تھی کہ تاجدارِ ختم نبوت ﷺ کی ناموس کا معاملہ تھا۔

ایک روز میرے اصرار پر ایک پہرے دار فوجی نے بتایا کہ انھیں سختی سے آرڈر ہے کہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے اور میرے ساتھ کوئی بات نہ کی جائے۔ اس نے بتایا کہ اگر کسی افسر نے اسے میرے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔

7 اپریل کی شب مجھے قلعے کے اندر ایک بڑی حوالات میں لے جایا گیا۔ یہاں مختلف علاقوں کے رضا کار موجود تھے۔ یہاں پہنچ کر یہ انکشاف ہوا کہ مسجد وزیر خاں میں جو جوشیلے نعرے لگائے گئے اور سائے کی طرح ہر وقت ہمارے ساتھ رہنے والے رضا کار اصل سی آئی ڈی کے ملازم تھے۔ سی آئی ڈی کے کچھ ملازم اس حوالات میں بھی ہماری جاسوسی کے لیے موجود تھے۔

رضا کاروں کے اس اجتماع میں کئی شناسا چہرے بھی تھے۔ لاہور کے علاوہ راولپنڈی اور کراچی کے وہ کارکن بھی موجود تھے جنھوں نے تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ یونس پہلوان اور ان کے ساتھیوں سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ ایک مدت بعد کارکنوں سے گفتگو کرنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ چنانچہ ہم سب رات تین بجے تک مختلف پہلوؤں پر بات چیت کرتے رہے۔

سی آئی ڈی کے ملازم پوری توجہ سے ہماری گفتگو سنتے رہے لیکن اب چونکہ ان کے چہرے بے نقاب ہو چکے تھے اس لیے ہم نے بڑے محتاط انداز میں باتیں کیں۔

پھر اچانک ایک پولیس انسپکٹر آیا اور اس نے میرا نام پکارا۔ پھر اس نے یونس پہلوان اور بلال گنج کے کارکن غلام نبی کا نام بھی پکارا اور کہنے لگا کہ مزنگ میں ایک قتل ہوا ہے اور اس میں آپ تینوں کا نام بھی آ رہا ہے لہٰذا آپ ہمارے ساتھ چلیں اور اپنی صفائی پیش کریں۔

ہمیں یہ بات سن کر بہت حیرانی ہوئی اور ہم نے اسے جواباً کہا کہ ہم 9 مارچ سے قلعے میں بند ہیں اور باہر کرفیو لگا ہے۔ قتل کرنے کے لیے ہم کیسے چلے گئے؟ ہم نے پولیس افسر پر واضح کر دیا کہ ہم رات کے وقت کہیں جانے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر اس نے کوئی انکوائری کرنی ہے تو صبح آئے۔ ہمارا جواب سن کر اس نے کہا کہ وہ اپنے افسران بالا کو بتا دے گا اور انھوں نے اسی وقت بلایا تو پھر ہمیں بلا حیل و حجت چلنا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔

8 اپریل کو عصر کے بعد ڈی ایس پی سی آئی اے نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کاغذ اور قلم میرے سامنے رکھ دیا اور مجھے کہا کہ میں جو کچھ بھی چاہتا ہوں کاغذ پر لکھ دوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ اس نے جواب میں مغلظات سنانا شروع کر دیں۔ میں یہ گالیاں برداشت نہ کر سکا اور میں نے اسے کہا کہ آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں لیکن میرے بزرگوں کو گالی نہ دیں ورنہ آپ کو بڑی سخت سزا ملے گی کیونکہ میرے بزرگوں کا تعلق اہل بیت سے ہے۔ یہ باتیں سن کر وہ مرعوب سا ہو گیا۔

اس کے بعد فائرنگ کی آواز آئی اور پھر سپاہی دفتر میں داخل ہوئے۔ ڈی ایس پی نے ان سے پوچھا آج کتنے اُتارے؟ انھوں نے جواب دیا۔ دو۔ سپاہی واپس چلے گئے اور پھر فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ ڈی ایس پی نے فون اٹھایا اور پھر وہی سوال دہرایا۔ اب کتنے اُتارے؟ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اب مزید چار افراد کو گولی ماردی گئی ہے۔ حکومت کے باغیوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ پھر اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ آپ تو شریف آدمی ہیں اس کاغذ پر معافی نامہ لکھ دیجیے۔ ہم آپ کو ابھی رہا کروا دیں گے۔

میں نے اس کو جواب دیا کہ جو حکومت ختم نبوت کی منکر ہو اور محمد مصطفی ﷺ کے باغی ہوں میں اس سے ہرگز معافی نہیں مانگ سکتا۔ میرا جواب سن کر اس نے کہا۔ میں اپنے یہی الفاظ کاغذ پر لکھ دوں۔ چنانچہ میں نے یہ الفاظ کاغذ پر لکھ دیئے۔

ڈی ایس پی نے یہ عبارت پڑھی تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے قلم زور سے زمین پر مارا اور کاغذ پھاڑ دیا۔ پھر مجھے مارنے کے لیے کرسی سے اچھلا۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی میں کرسی کا تکیری پکڑ سکا لیکن اس پر اللہ کے فضل سے ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ مجھے کچھ کہے بغیر دفتر سے باہر چلا گیا۔

پھر ایک سپاہی آیا اور اس نے مجھے قلعے کے دروازے کے پاس حوالات میں لے جا کر بند کر دیا۔ اس روز دوپہر کو مجھے نہ تو کھانا دیا گیا اور نہ ہی پانی مل سکا۔ ظہر اور عصر کی نماز میں نے تیمم سے ادا کی۔ مغرب کے وقت مجھے وضو کے لیے پانی دے دیا گیا اور پھر مجھے کھانا بھی دیا گیا جس میں خلاف معمول پھل بھی تھے۔

تقریباً 9 بجے مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بڑے کمرے میں لایا گیا۔ یہاں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مجھے سیدھا کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سپاہی نے میرے بازو پکڑ کر اوپر کر دیئے اور ٹانگیں چوڑی کرنے کو کہا۔ اسی حالت میں دو تین گھنٹے گزر گئے۔ پھر وہ سپاہی چلا گیا اور اس کی جگہ دوسرا آ گیا اسی طرح تین تین گھنٹے کے بعد ڈیوٹیاں بدلتی گئیں۔ جونہی میں ہاتھ ذرا نیچے کرتا ڈیوٹی پر موجود سپاہی فوراً میرا بازو پکڑ کر ہاتھ اوپر کر دیتا۔ یہ اذیت ناک سلسلہ ساری رات جاری رہا۔

فجر سے دو گھنٹے قبل میرے پیٹ اور سینے میں شدید درد اُٹھا اور میں گھبرا کر گرنے لگا لیکن ان لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر میں نے تہجد کے نفل ادا کرنے کی اجازت مانگی لیکن اس سے بھی انکار کر دیا گیا۔ درد سے نجات کے لیے میں نے درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔ چند ہی لمحے بعد کافی افاقہ ہو گیا۔

نماز فجر ادا کرنے کی اجازت بھی نہ مل سکی۔ رات 9 بجے سے صبح 11 بجے تک یہی عالم رہا۔ طبیعت نہایت مضمحل تھی اور تھکاوٹ سے بدن چور چور ہو رہا تھا۔ میں نے سیدی سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ سے استغاثہ کیا اور یہ اشعار پڑھنے شروع کیے:

غوث اعظم بمن بے سرو ساماں مدد دے
قبلۂ دیں مدد دے کعبہ ایماں مدد دے

اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور مجھے ہتھکڑی لگا کر حوالات میں لے گیا۔ یہاں ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ مجھے سونے نہ دے۔ پانی کا گھڑا لا کر رکھ دیا گیا مگر کھانا نہ ملا۔ نماز ظہر کے بعد میں نے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس کی طرف رُخ کیا اور اس شعر کا ورد شروع کر دیا:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

عصر کے بعد سپاہی چلا گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں سبز رنگ کی روشنی ہے۔ اس کمرے کی سیڑھیاں ہیں جس پر والد محترم حضرت علامہ سید ابوالحسنات (جو اُس وقت سکھر جیل میں تھے) کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے سینے سے لگا لیا۔ مَیں نے ان سے پوچھا۔ آپ کا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے جواباً فرمایا کہ مجھے بھی انھوں نے رات بھر کھڑا رکھا ہے۔

اس گفتگو کے بعد میں ان سیڑھیوں سے نیچے کمرے میں اترا تو دیکھا کہ شمالی جانب ایک دروازہ ہے جو کھلا ہوا ہے۔ میں اس کمرے میں دوزانو بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک بزرگ سپید نورانی چہرہ کشادہ پیشانی، درمیانہ قد، سفید داڑھی کھلی آستینوں کا سبز کرتہ زیب تن کیے میری طرف تشریف لائے اور پیچھے سے ایک آواز آئی: ''سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لا رہے ہیں۔'' میں نے دست بستہ حضرت سے عرض کیا۔ حضور ان کتوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ نے میری داہنی پشت پر تھپکی دی اور فرمایا۔ شاباش بیٹا گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے دوبارہ عرض کی حضور! انھوں نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ رخ انور پر مسلسل شگفتگی تھی فرمایا کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے اور یہ کہہ کر آپ واپس تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد میرا حوصلہ بہت بلند ہو گیا ورنہ اس رات کی اذیت سے ممکن تھا کہ میں ڈگمگا جاتا لیکن سرکار غوث پاک رضی اللہ عنہ کے روحانی کرم نے مجھے

چین اور قلبی سکون سے مالا مال کر دیا۔ مغرب کے بعد مجھے کھانا دیا گیا اور پھر رات کو کسی نے مجھے پریشان نہیں کیا۔

پھر مجھے ایک دوسری حوالات میں منتقل کر دیا گیا جو قدرے بہتر تھی۔ وہاں میں نے مولانا عبدالستار خان نیازی کی آواز سنی۔ مولانا تلاوت کلام پاک فرما رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی قریبی حوالات میں ہیں۔ دوپہر کے وقت مجھے ایک بیرک میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے بالکل سامنے مولانا عبدالستار خان نیازی تھے۔ مولانا نے اشارے سے سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ فاصلہ چونکہ خاصا تھا اس لیے مزید کوئی بات نہ ہو سکی۔

پھر سی آئی اے کے ایک افسر اعجاز حسین (جو کہ میرے واقف کار تھے اور چوک نواب صاحب میں رہتے تھے) میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے ایک چادر اور کچھ کپڑے دیئے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کپڑے میرے تایا حافظ غلام احمد نے بھیجے ہیں۔ اس سے پہلے میرے کپڑے بہت زیادہ پھٹ چکے تھے اور بنیان میں جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا حافظ صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ کپڑے بھی وہ اپنی ذمہ داری پر لائے ہیں وگرنہ اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔

مغرب کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے دل میں خیال آیا کہ یہاں خشک روٹی اور چنے کی دال کے سوا کچھ نہیں مل رہا اگر اپنے گھر میں ہوتے تو حسب منشاء کھانا کھاتے لیکن دوسرے ہی لمحے ضمیر نے ملامت کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ میں نے سر دھو کر توبہ کی اور اس وسوسے کا ازالہ چاہا۔

لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ چند لمحے بعد اندھیرے میں ایک ہاتھ آگے بڑھا اور آواز آئی۔ شاہ جی اسے لے لو۔ پھر ایک لفافہ مجھے دے دیا گیا جس میں کچھ پھل اور مٹھائی تھی۔ میں حیران رہ گیا کہ اتنے سخت پہروں کے باوجود یہ سب کچھ مجھ تک کیسے پہنچ گیا؟ لیکن میرے دل کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ دعوت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے میں ملی ہے۔ وہ پھل اور مٹھائی تین روز تک میں استعمال کرتا رہا۔

10 اپریل کو تقریباً گیارہ بجے مجھے چارج شیٹ دی گئی۔ میرے خلاف 29 مختلف دفعات کے تحت مقدمات قائم کیے گئے تھے۔ ان میں قتل و غارت اور فوج میں بدامنی پیدا کرنے کے مقدمات بھی شامل تھے۔ دوپہر ایک بجے کے قریب مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا اور بول جیل کے قریب ایک فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔ فوجی عدالت میں کیپٹن شفیق نے پولیس افسر سے پوچھا کہ ہتھکڑی کیوں لگائی گئی ہے؟ پولیس افسر نے کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے حکم دیا کہ ہتھکڑی کھول دی جائے۔ چنانچہ عدالت ہی میں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مختصر سی عدالتی کارروائی کے بعد مجھے سنٹرل جیل (شادمان کالونی) پہنچا دیا گیا۔

میں سنٹرل جیل پہنچا تو وہاں ایک میلے کا سماں تھا۔ بارکوں کے باہر ہزاروں افراد کا اجتماع تھا۔ بارکوں میں جگہ ختم ہو جانے کے باعث خاردار تار لگا کر شمع رسالت کے پروانوں کو حراست میں رکھا گیا تھا۔ جیل کے مختلف حصوں میں عجیب کیف و سرور کی محفلیں برپا تھیں۔ کہیں نعت خوانی ہو رہی ہے تو کہیں ختم نبوت کے موضوع پر تقاریر، کہیں درود و سلام پڑھا جا رہا ہے تو کہیں ذکر و اذکار کا غلغلہ ہے۔ غرض ایک عجب منظر دیکھنے میں آیا۔

مجھے "سی کلاس" کی ایک بیرک میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ رکھا گیا۔ دوسرے روز میں نے دیکھا کہ جیل کے گیٹ پر قطار کی صورت میں کچھ لوگ آ رہے ہیں جنھوں نے کندھوں پر بستر اٹھا رکھے تھے۔ میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ ان میں میاں طفیل محمد، مولانا کوثر نیازی، مولانا امین احسن اصلاحی، نصر اللہ خان عزیز نقی علی اور جماعت اسلامی کے بہت سے کارکن ہیں۔ ان حضرات سے علیک سلیک ہوئی اور میں نے پوچھا حضرات! آپ کیسے تشریف لائے؟ جماعت اسلامی کے ایک سرکردہ رہنماء نے جواب دیا۔ "ہم تو گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے ہمیں پکڑ کر لے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کا جرم کیا ہے؟" (یعنی کس جرم میں آپ کو پکڑ کر لائے ہیں؟ وہ بولے۔ "جرم کا تو خود ہمیں بھی علم نہیں۔ ان حضرات کو بھی مختلف بارکوں میں جگہ دی گئی۔

جیل کے اندر ہی کچھ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں تھیں جو لوگ یہ تحریر لکھ دیتے

تھے کہ ان کا تحریک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی رہائی فوراً عمل میں آ جاتی تھی۔ باوجود یہ کہ کافی لوگ اس طرح رہا ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن جیل کی رونق اور گہما گہمی میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔

تیسرے روز مولانا عبدالستار خان نیازی کو بھی قلعے سے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مودودی کو بھی گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا۔ ان دونوں حضرات کو اے کلاس کی بیرک دے دی گئی اور ملاقات پر پابندی عائد کر دی گئی۔

میرے ساتھ سی کلاس میں اندرون دہلی دروازہ جگو دگی کے پہلوان اور یکی دروازہ کے چند نامی گرامی غنڈوں کو رکھا گیا تھا۔ ایک روز مجھے جیل میں علم ہوا کہ میرے چچازاد بھائی علامہ سید محمود احمد رضوی (جو کہ بعد میں مجلس تحریک نبوت 1974ء کے مرکزی جنرل سیکرٹری بنے) کو بھی گرفتار کر کے جیل میں لایا گیا ہے۔ میں نے مہر محمد حیات ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سے مطالبہ کیا کہ انھیں میرے ساتھ رکھا جائے۔ انھوں نے فوراً یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ سید محمود رضوی صاحب مجھے دیکھتے ہی بغلگیر ہو گئے اور میں نے ان کی خیریت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا ہیں۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ سائیکلو ٹائل کے ذریعے جو ہدایات پورے شہر میں پہنچائی جاتی تھیں وہ انھی کے قلم سے لکھی جاتی تھیں۔ ان کی گرفتاری بھی اسی بناء پر عمل میں آئی ہے۔ سید محمود صاحب سے تحریک کی صورتحال اور گھر کی خیریت کا علم ہوا۔ ہمیں اہم کیس کی بارکوں میں رکھا گیا تھا۔ ہمارے قریبی بارکوں میں مولانا غلام محمد ترنم صدر جمعیت علمائے (مغربی) پاکستان بھی تھے اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انھی بارکوں میں ایک نو سالہ بچہ خالد بھی تھا جس کے خلاف بغاوت، ڈاکہ اور آتش زنی وغیرہ جیسے سنگین نوعیت کے مقدمات بنائے گئے تھے۔ آٹھ روز بعد فوجی عدالت سے اسے رہا کر دیا گیا۔ مجھے ابھی تک اپنے والد محترم کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں اور نہ ہی میرے متعلق انھیں کوئی علم تھا۔ البتہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ کراچی جیل میں انھیں میرے قتل کی اطلاع دی گئی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور سید مظفر علی شمسی کا بیان ہے کہ چند روز تک تو ہم

نے یہ خبر علامہ ابوالحسنات قادری سے چھپائے رکھی اور آخر کار ایک روز ہم نے انھیں بتا ہی دیا کہ آپ کے صاحبزادے کو موت کی نیند سلا دیا گیا ہے۔ علامہ ابوالحسنات یہ سنتے ہی سجدے میں گر گئے اور انھوں نے فرمایا میرے آقا گنبد خضراء کے مکین ﷺ کو میرے اکلوتے بیٹے خلیل کی قربانی قبول ہے تو میں بار بار سجدہ شکر ادا کرتا ہوں ناموس رسالت پر ایک خلیل تو کیا میرے ہزاروں فرزند بھی ہوں تو اُسوۂ شبیری پر عمل کرتے ہوئے سب کو قربان کردوں۔

اس کے بعد انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر کا آغاز کر دیا۔ بعد میں والد صاحب کو سکھر جیل منتقل کر دیا گیا تھا۔ خود ان کا بیان ہے جیل میں جب بھی مجھے تمہاری یاد آئی تو میں قرآن کی تفسیر شروع کر دیا کرتا تھا اس سے دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جیل میں انھوں نے نصف قرآن کی تفسیر مکمل کی اور باقی رہائی کے بعد تحریر فرمائی۔

چارج شیٹ میں فردوس شاہ ڈی ایس پی کے قتل کا الزام مجھ پر اور مولانا عبدالستار خاں نیازی پر عائد کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل یہ بتائی گئی تھی کہ مسجد وزیر خاں میں مولانا عبدالستار خان نیازی جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے اور میں صدارت کر رہا تھا۔ فردوس شاہ (ڈی ایس پی) پولیس سپاہیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا ہی تھا کہ مولانا عبدالستار نیازی نے کہا۔ ان کتوں کو مسجد سے نکالو۔ میں نے صدارت کی کرسی سے کہا۔ جانے نہ پائیں یہیں ختم کر دو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسجد میں نہ تو کوئی جلسہ ہو رہا تھا اور نہ تقریر بلکہ ایک جلوس چوہٹہ بستی بھگت سے نکلا، فردوش شاہ ایک سپاہی کے تحفظ کے لیے آ رہا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔

میرے خلاف مقدمہ قتل ایک فوجی عدالت میں چلایا گیا جو کہ سنٹرل جیل اور بوسٹل جیل کے درمیان لگائی گئی تھی۔ یہ مقدمہ تقریباً 19 روز تک فوجی عدالت میں زیر سماعت رہا۔ حکومت کی طرف سے جو گواہ پیش ہوئے تھے وہ جرح کے دوران پسینے سے شرابور ہو جاتے اور ان کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا۔

مولانا عبدالستار خاں نیازی اور میری طرف سے چوہدری نذیر احمد (سابق اٹارنی جنرل) میاں غیاث الدین، رفیق احمد باجواہ، چوہدری کلیم الدین اور چند دیگر وکلا

فوجی عدالت میں پیش ہوئے۔

چوہدری نذیر احمد جب گواہوں پر جرح کرتے تو گواہوں کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ ایک گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ فردوس شاہ کی لاش مسجد وزیر خاں کے دروازے پر پڑی تھی اور میں اس کو اُٹھا کر چوک وزیر خاں میں لے آیا اور پھر میں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ اس نے ایک شیشی جائے وقوعہ سے لی گئی خون آلود مٹی بھی عدالت میں پیش کی۔ فوجی عدالت نے جو کہ ایک بریگیڈیئر اور دو کرنلوں پر مشتمل تھی مجھ سے مسجد وزیر خاں میں جمعہ کا وقت پوچھا جو میں نے بتا دیا۔ پھر عدالت نے کہا کہ وہ خود اگلے روز دس بجے صبح جائے وقوعہ کا معائنہ کرے گی۔

چنانچہ اگلے روز مولانا عبدالستار خاں نیازی اور میں فوجی عدالت اور چند دیگر افراد کے ہمراہ مسجد وزیر خاں میں آئے۔ ہمیں دیکھ کر لوگ مکانوں کی چھتوں اور مکانوں سے محبان تاجدار ختم نبوت کے نعرے لگانے لگے اور فوجی عدالت نے اپنی آنکھوں سے ملت اسلامیہ کے جذبات کا مشاہدہ کیا۔ جب عدالت جائے وقوعہ پر پہنچی تو وہاں پر گواہ کے بیان کے بالکل برعکس مٹی کے بجائے سنگ سرخ کی سیڑھیاں تھیں۔ 19 روز کی عدالتی کارروائی کے بعد عدالت نے ہمیں مقدمہ قتل سے بری کر دیا۔

بری ہونے کے بعد ہم جیل سے سامان لینے کے لیے گئے تو سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے اور مولانا نیازی کو کہا کہ آپ جلدی سے گھر ہو آئیں کیونکہ دوبارہ گرفتاری کا خدشہ ہے۔ چنانچہ ہم سامان لیے بغیر ہی جیل سے چلے آئے۔ گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے اور پھر حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمہ کے مزار اقدس پر پہنچ کر حاضری دی۔ واپسی پر دربار شریف کے باہر لوگوں نے گھیر لیا اور پھولوں کے ہار پہنائے۔ یہاں کئی دوستوں س بھی ملاقات ہوگئی۔

مارشل لاء کی پابندیاں اگرچہ کافی نرم ہو چکی تھیں لیکن مارشل لاء کے اثرات ابھی بہت زیادہ باقی تھے۔ چوراہوں پر فوجیوں کی ریت کی بوریوں سے مورچے بنائے ہوئے تھے۔ میں دربار شریف سے گھر جانے کے لیے تانگے پر بیٹھا۔ ابھی تانگہ لوہاری گیٹ تک ہی پہنچا تھا کہ پیچھے سے ایک فوجی جیپ آئی۔ اس نے ہارن دیا اور رکنے کا

اشارہ کیا۔

ایک فوجی افسر نے میرے قریب آ کر وارنٹ دکھائے اور کہا تشریف لے آیئے آپ کو دوبارہ گرفتار کیا جا رہا ہے۔ مجھے چند گھنٹے تھانہ میں رکھنے کے بعد شاہی قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ اس روز لوہاری دروازے سے کچھ افراد گرفتار ہو کر آئے تھے اور ان کے گھر کا کھانا بھی موجود تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ میں نے بھی کھانا کھایا۔

ایک رات قلعے میں گزارنے کے بعد مجھے اگلے روز سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا۔ مولانا محمو احمد رضوی کو جیل ہسپتال کے ٹی بی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور ملاقات پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ پھر تقریباً ایک ماہ تک فوجی عدالت میں 7 مارچ کو مسجد وزیر خاں میں ہونے والی میری تقریر کے خلاف مقدمہ زیر سماعت رہا۔

اس مقدمہ میں بھی میری پیروی ان وکلاء صاحبان نے ہی کی جو مقدمہ قتل میں پیش ہوئے تھے۔ اگرچہ سرکاری گواہیاں جرح کے دوران ساقط ہو چکی تھیں لیکن مجھے سات سال قید مشقت کی سزا سنا دی گئی اور مجھے جیل میں قیدیوں کا لباس پہنا دیا گیا۔ پہلے بان اور چرخی کی مشقت دی گئی۔

اسی دوران مولانا عبدالستار نیازی (جنھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا تھا) اور مودودی کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی کو جس وقت سزائے موت سنائی گئی میں فوجی عدالت میں موجود تھا۔ انھوں نے سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد گرج کر کہا۔ ”بس، اس سے بھی زیادہ کوئی سزا آپ کے پاس ہے تو دے دیجیے۔ میں ناموس مصطفیٰ ﷺ کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“

مولانا نیازی نے اس موقع پر کچھ اشعار بھی پڑھے، ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سزائے موت کا فیصلہ سن کر انھیں ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہوا۔

مجھے سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فوجی عدالت نے مقدمہ بغاوت کی سماعت شروع کر دی اور سرسری کارروائی کے بعد مجھے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

فوجی عدالت کے سربراہ نے فیصلہ پڑھا ”ملزم کو گلے سے اس وقت تک

پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک وہ مر نہ جائے۔"

سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد ایک لمحے کے لیے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا لیکن مابعد آیت کریمہ بل احیاء ولکن لا تشعرون زبان پر آگئی۔ پھر حوصلے کا یہ عالم تھا کہ جام شہادت نوش کرنے کے لیے طبیعت مچلنے لگی اور جنت کے لہلہاتے باغات آنکھوں میں گھومنے لگے۔ مجھے سزائے موت کے قیدیوں کے لیے مخصوص "کوٹھی" میں لا کر بند کر دیا۔ میں اپنے بخت پر ناز کرنے لگا کہ مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحفظ کی خاطر جان کی قربانی پیش کرنے کی سعادت حاصل ہونے والی ہے۔

تین روز بعد مجھے دوبارہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے میری سزائے موت چودہ سال قید میں تبدیل کر دی حالانکہ میں نے سزا میں تخفیف کے لیے کوئی اپیل نہ کی تھی۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ میرے علاوہ مولانا نیازی اور مودودی صاحب کو سزائے موت کے فیصلے کے خلاف افغانستان کے ممتاز روحانی پیشوا ملا شور بازار (کابل)، حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی (مدینہ منورہ) کی طرف سے اور دیگر اسلامی ممالک کے گوشے گوشے سے حکومت پاکستان کو تاریں اور قراردادیں موصول ہونا شروع ہوگئی تھیں جن میں ہماری فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اندرون ملک بھی بڑا مؤثر ردعمل ہوا۔

دوسری طرف مرزائیوں کے سرخیل بشیر الدین محمود کے لڑکے ناصر محمود کو رہا کر دیا گیا۔ سر ظفر اللہ اس وقت وزیر خارجہ تھا اور تحریک کا ایک اہم مقصد مرزائیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹانا بھی تھا۔ ظفر اللہ نے ذاتی طور پر دلچسپی لے کر ناصر محمود کو رہا کروایا اور پاکستان کے طول و عرض میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔

سردار عبدالرب نشتر نے ہماری سزائے موت کو ختم کرانے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ خان عبدالقیوم خان اس وقت وزیر داخلہ تھے۔ انھوں نے تحریک کے لیے انتہائی تشدد آمیز رویہ اختیار کیا۔

میری سات سال اور چودہ سال کی سزائیں ایک ساتھ ہی شروع ہوگئی تھیں۔

میں بدستور سی کلاس میں تھا۔ یہاں پر چنے کا ناشتہ اور دال روٹی کھانے کو ملتی تھی۔ دال نہایت عجیب اور بدمزہ ہوتی تھی۔ مسلسل کھانے سے دل اکتا چکا تھا۔ پھر ایک قیدی قمرالدین نے مجھے سالن دینا شروع کر دیا اور یوں گزارہ ہونے لگا۔

ایک روز میں نے سکھر جیل کے پتے پر والد محترم کو اپنی خیریت کا لکھا جس کا جواب مجھے پندرہ روز کے بعد موصول ہوگیا۔ والد صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ تم رتبۂ شہادت حاصل نہیں کر سکے۔ لیکن بہرحال یہ جان کر دل کو اطمینان ہوا کہ تم ناموس مصطفیٰ کی خاطر لڑ رہے ہو۔ خط کے آخر میں لکھا ''کاش اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کی قربانی قبول فرمالیتا۔''

چند روز بعد مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا مودودی کی سزائے موت بھی چودہ سال قید بامشقت میں تبدیل ہوگئی اور انھیں اے کلاس کی بارکوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ مجھے بدستور اسی کلاس میں ہی رکھا گیا تھا۔ میں اکثر دوپہر کے وقت مشقت سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نیازی اور مولانا مودودی سے ملاقات کے لیے ان کی بارک میں چلا جایا کرتا تھا۔ یہ دونوں حضرات زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔

دوپہر کے وقت مولانا نصراللہ خان عزیز لطائف کی محفل جماتے۔ ایک روز دوپہر کے وقت میری طبیعت خراب ہوگئی، اُلٹیاں اور چکر آنے لگے۔ میں مولانا مودودی کی بارک میں داخل ہوا تو مولانا نے حسب معمول خیریت دریافت کی اور میری طبیعت ناساز پا کر انھوں نے اپنا کام چھوڑ دیا اور فوراً میری تیمارداری میں لگ گئے۔ انھوں نے جیل کے ڈاکٹر کو بلانے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر موجود نہ تھا۔ پھر انھوں نے اپنی دواؤں میں سے مجھے دوا دی جس سے میری طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ اس طرح ان کے اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا۔

نصراللہ خان عزیز، سید نقی علی اور مودودی صاحب کے دیگر رفقاء جیل میں اکثر مودودی صاحب کی تصنیفات تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے مولانا کا ایک کتابچہ ''تجدید احیائے دین'' پڑھنے کے لیے دیا۔ میں نے اسے بغور پڑھا تو معلوم

ہوا کہ اس میں اولیاء کرام کی تنقیص کی گئی ہے اور بزرگان دین سے عقیدت کو ہندوازم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اور بھی کئی قابل اعتراض عبارات نظر سے گزریں۔

پھر ایک روز مجھے مودودی صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کا موقع ملا تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کتابچہ میں اولیاء کرام کے وجود سے انکار کیا ہے اور ان سے عقیدت کو ہندوازم سے تعبیر کیا ہے۔ آپ یہ الفاظ لکھنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں؟ انھوں نے جواب دیا۔ "مجھے تو آج تک کوئی ولی نظر نہیں آیا۔"

میں نے عرض کی۔ اگر آپ کو کوئی ولی نظر نہیں ایا تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ دنیا میں کوئی ولی موجود ہی نہیں اور آپ نے تو کسی نبی یا رسول کو بھی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ بھی تو کبھی آپ کو نظر نہیں آیا، چنانچہ اگر آپ کا وضع کردہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا اور رسول کے وجود سے بھی انکار کرنا پڑے گا؟

یہ باتیں سن کر مودودی صاحب نے کہا یہ کتابچہ میں نے اس زمانے میں تحریر کیا تھا جب میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور انسان سے غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کی اس غلطی سے جو لوگ گمراہ ہوئے ہوں گے ان کا ذمہ دار کون ہے؟ مولانا نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی اور میں نے انھیں کہا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کی شان میں واضح طور پر فرمایا ہے الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون اور اس کے علاوہ بھی قرآن پاک میں اولیاء کرام کے متعلق بہت سی آیات موجود ہیں لہٰذا آپ کے اس کتابچہ کی اصلاح ہونی چاہیے۔ مودودی صاحب کچھ جواب دینا چاہتے تھے لیکن اسی اثناء میں ان کے کچھ رفقاء آگئے اور بات دوسری طرف چل نکلی۔ اس کے بعد ان سے کئی بار نہایت خوشگوار ماحول میں گفتگو کا موقع ملتا رہا۔

ایک روز جیل میں یہ اطلاع ملی کہ کچھ قیدیوں نے جیلر کی توہین کی ہے اور اس جرم میں انھیں بید لگائی جائے گی۔ ہم اپنی بارک سے اس مقام کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں پانچ چھ افرا کو نہایت بے دردی سے بید لگائے گئے۔ ہم نے

چھپ کر یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لوگوں کے جسم سے گوشت قیمے کی طرح کٹ کر فضا میں اُڑتا ہوا نظر آیا۔ اس دردناک واقعہ کی مکمل تفصیل ہم نے لکھ کر ممبران اسمبلی کو ارسال کی اور صوبائی اسمبلی میں حکومت کی طرف سے باقاعدہ یہ یقین دہائی کرائی گئی کہ آئندہ جیل میں کسی ملزم کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک نہیں کیا جائے گا۔

اسی دوران مولانا احمد علی لاہوری کو ملتان سے سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ کچھ علیل تھے اس لیے انھیں جیل کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ پھر دو روز بعد معلوم ہوا کہ انھیں رہا کر دیا گیا ہے۔ ان کی رہائی کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی چنانچہ اس سلسلہ میں جیل میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ وہ معافی مانگ کر رہا ہو گئے ہیں۔

1954ء میں حکومت نے ایک انکوائری کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن کے قیام سے دو روز قبل مجھے جیل میں بی کلاس دے دی گئی۔ اب میرا قیام جیل کے اس حصے میں تھا جہاں مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا مودودی اور نصراللہ خاں عزیز وغیرہ تھے۔ انکوائری کمیشن کے قیام کے بعد سکھر جیل میں نظر بند تمام رہنماؤں کو سنٹرل جیل لاہور منتقل کر دیا اور ان تمام حضرات کو سنٹرل جیل کے ایسے حصے میں رکھا گیا جس کو دیوانی گھر کہا جاتا ہے۔

جب میں پہلی بار ان حضرات سے ملاقات کے لیے دیوانی گھر کے دروازے پر پہنچا تو سب سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے ''شہید اعظم'' کہہ کر پکارا اور بغل گیر ہوئے۔ چند قدم آگے بڑھا تو شیخ حسام الدین انصاری سے ملاقات ہوئی۔

میں نے اپنے والد محترم کے متعلق دریافت کیا تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے برگد کے درخت کی طرف لے گئے جہاں میرے والد محترم ایک چارپائی پر بیٹھے قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ پہلی نظر میں تو میں انھیں پہچان بھی نہ سکا کیونکہ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ والد محترم نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر سینے سے لگا لیا۔ میں نے عرض کی۔ آپ اتنے کمزور کیوں ہو گئے؟ والد محترم نے فرمایا۔ ''سکھر جیل سخت جیل تھی (125.8 °F) ڈگری گرمی تھی اور جس بارک

میں ہمیں رکھا گیا تھا اس کے اوپر لوہے کی چادریں تھیں، پانی بھی وقت کی پابندی کے ساتھ آرہا تھا، اکثر پینے کی بجائے غسل کر کے تفسیر کا کام شروع کر دیتا تھا۔"

قائدین کی آمد کے بعد جیل میں بہت زیادہ رونق اور چہل پہل ہوگئی تھی۔ اکثر علماء والد محترم سے ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے۔ والد صاحب قبلہ جیل سے ملنے والے راشن سے مٹھائی وغیرہ تیار کر کے گیارہویں شریف کے ختم کا اہتمام کرتے تھے۔

ایک روز مولانا غلام محمد ترنم (جنھیں دیوانی گھر سے کچھ فاصلے پر واقع "اہم کیس" کی بارکوں میں رکھا گیا) معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل کا ہاتھ پکڑ کر انھیں والد صاحب کے پاس لے آئے اور انھوں نے ازراہِ مذاق فرمایا کہ آج اس وہابی کو گیارہویں شریف کا تبرک کھلانا ہے۔ مولانا اسماعیل ہنستے ہوئے گیارہویں شریف کی محفل میں بیٹھ گئے۔ ان کے علاوہ عطاء اللہ شاہ بخاری اور کئی دیگر دیوبندی اور وہابی علماء بھی اس محفل میں شریک تھے سوائے مولانا محمد علی جالندھری (ملتان) کے جو بدعت بدعت کی گردان کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے جاتے تھے اور تبرک لینے سے بھی انکار کرتے تھے۔

مولانا اسماعیل صاحب نے فاتحہ خوانی میں شرکت کرنے کے بعد کہا کہ اگر یہی گیارہویں شریف ہو تو آپ میرے گھر روزانہ آیئے اور گیارہویں شریف کی فاتحہ کیجیے۔ پھر انھوں نے تبرک بھی کھایا۔ اس کے بعد وہ اکثر والد صاحب سے علمی گفتگو کرتے رہتے تھے۔

ایک روز گیارہویں شریف کی محفل میں مودودی صاحب بھی شریک ہوئے اور انھوں نے تبرک بھی کھایا۔ اس دوران ان کی والد صاحب سے چند علمی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی۔ شام کو میں مودودی صاحب سے ان کی بارک میں ملا تو وہ مجھے کہنے لگے۔ مولانا ابوالحسنات سے ملاقات کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اور ان کے تبحر علمی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنا تبحر ان کے سپرد کر دوں تا کہ وہ اس کی اصلاح کر دیں۔ میں نے مودودی صاحب سے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بہت

بڑا کام ہوگا۔

دوسرے روز میں والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے مودودی صاحب سے گزشتہ روز کی گفتگو کا ذکر کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اس موقع پر موجود تھے انھوں نے کہا ''یہ سب منافقت ہے مودودی کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔'' انھوں نے اس موقع پر مودودی صاحب کے خلاف اور بھی بہت سخت الفاظ استعمال کیے اور پھر جیل میں ان کے ورکروں نے مودودی صاحب کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ جیل سے باہر مولانا احمد علی لاہوری نے مودودی صاحب کے خلاف اپنی مہم تیز تر کر دی اور روزنامہ ''نوائے پاکستان'' کے ذریعے پروپیگنڈہ کا اچھا خاصا محاذ قائم کر لیا لیکن میں بدستور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہا تا کہ مودودی صاحب کے لٹریچر کی اصلاح کروائی جا سکے۔

پھر جسٹس منیر (لاہوری ہائی کورٹ) انکوائری کمیشن نے تحریک ختم نبوت کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع کر دی۔ عدالت میں مودودی صاحب کا رویہ انتہائی افسوسناک اور خلاف توقع تھا۔ انھوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ انھیں ڈائریکٹ ایکشن اور تحریک کے دیگر پہلوؤں سے کوئی اتفاق نہیں تھا۔ اس پر حافظ خادم حسین، مولانا غلام محمد ترنم اور حضرت والد محترم نے سخت جرح فرمائی۔ مودودی صاحب تو یہاں تک کہہ گئے کہ انھوں نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط ہی نہیں کیے تھے۔ اس پر والد صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس وہ دستاویز اب بھی موجود ہے جس میں ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر آپ نے دستخط کیے تھے۔ یہ بات سن کر مودودی صاحب نے کہا ہاں میں نے چھوٹے سے دستخط کیے تھے۔ والد صاحب نے فرمایا تو کیا ہمیں آپ کے دستخطوں کا بورڈ لکھوا کر لگانا چاہیے تھا؟ مودودی صاحب لاجواب ہو گئے اور والد صاحب نے وہ دستاویز عدالت میں پیش کر دیں جس پر ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ تحریر تھا۔ مودودی صاحب کے علاوہ کسی راہنما نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط نہیں کیے تھے۔

بہرحال میں پہلے پہل تو مودودی صاحب کے اخلاق سے بہت متاثر تھا لیکن

ان کی اس صریح غلط بیانی اور بزدلانہ روش سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ انکوائری کا سلسلہ جاری رہا لیکن چونکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت یہ کمیشن بٹھایا گیا تھا اس لیے کوئی واضح نتیجہ سامنے نہ آیا۔ چنانچہ ممتاز صحافی مرتضٰی احمد خاں مکیش نے اپنی کتاب ''محاسبہ'' میں اس کمیشن کی کارکردگی پر تفصیلی تبصرہ کیا اور تمام پہلوؤں کو واضح کیا۔

انکوائری کے دوران ایک روز والد محترم دیوانی گھر میں تشریف فرما تھے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین صاجزادہ فیض الحسن سید مظفر علی شاہ اور کچھ دیگر حضرات بھی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ ماسٹر تاج الدین انصاری نے والد صاحب سے کہا۔ حضرت! موسم بہار ہے اور مجھے موچی دروازے کی یاد ستا رہی ہے ہمیں کسی طرح جیل سے باہر جانا چاہیے۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا۔ یہاں ہم ایک عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آئے ہوئے ہیں اور پھر میں تو کلام پاک کی تفسیر میں بھی مصروف ہوں باہر جا کر ہم لوگ نہ جانے کن مصروفیات میں الجھ جائیں۔ آیئے بارگاہ الٰہی میں دعا کریں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے اس مقدس مقصد کو پورا فرمائے جس کی خاطر ہم جیل آئے ہیں۔ سب نے آمین کہا۔

والد صاحب نے دعا فرمائی۔ الٰہی! حبیب کریم ﷺ کے صدقے اس جیل کے قیدیوں کو آزادی کی نعمت سے متمتع فرما۔ اس جیل کی دیواروں کو گرا دے اور یہاں باغ و بہار بنا دے۔ سب نے اس دعا پر بھی آمین کہا۔ یہ کچھ ایسی مقبول ساعت تھی کہ آج اس دعا کا ایک ایک لفظ مقبول و منظور ہو کر ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ وہی سنٹرل جیل آج شادمان کالونی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کی اونچی اونچی دیواریں گر چکی ہیں اور جیل کی بارکیں باغ و بہار کا نقشہ پیش کر رہی ہیں۔

تقریباً ایک سال بعد ہائی کورٹ نے کراچی میں گرفتار ہونے والے تمام راہنماؤں کو رہا کر دیا لیکن مولانا نیازی، مودودی اور مجھے رہا نہیں کیا گیا تھا۔

طویل عرصے تک جیل میں رہنے سے تقریباً سبھی حضرات ذیابیطس (شوگر) کے مریض ہو گئے تھے۔ ادھر عوام کے دلوں میں تحریک کے جذبات ابھی تک موجود تھے

لیکن جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور بے انتہا تشدد کر کے تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ ہمارے علاوہ تحریک کے دیگر بہت سے رضا کار ابھی تک جیلوں میں تھے۔

جیل سے رہا ہونے والے زعماء نے اپنے مطالبات کے احیاء کے لیے دہلی دروازے کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کیا۔ اس جلسہ کی صدارت والد صاحب نے کی اور مختلف رہنماؤں نے اس جلسہ سے خطابات کیے اور تحریک کے حامیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

اس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد (جون 1955ء) میں ایک روز میں عصر کے بعد بیٹھا تھا کہ اچانک جیل کے آفیسر نے آ کر کہا کہ آپ کی رہائی کے آرڈر آئے ہیں۔ میرے لیے یہ بات خلاف توقع تھی اور پہلے میں نے اسے مذاق ہی سمجھا لیکن پھر جیل کے آفیسر نے چلنے کو کہا تو مولانا نیازی اور مودودی نے مجھے مبارکباد دی۔ میری رہائی کے تقریباً چھ سات ماہ بعد مولانا نیازی اور مودودی کو بھی رہا کر دیا گیا۔

جیل سے رہائی کے بعد مودودی صاحب نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں انھوں نے دیگر معززین شہر کے علاوہ مجھے بھی مدعو کیا۔ میں نے اس موقع پر مودودی صاحب سے کہا۔ اب حالات معمول پر آ چکے ہیں اپنا وعدہ پورا کیجیے اور اپنا سارا لٹریچر مجھے دیجیے تا کہ والد صاحب سے اس کی اصلاح کروا دوں۔ لیکن مولانا مودودی نے ٹالنے کی کوشش کی۔ میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے۔ جیل میں میرا ارادہ تو بنا تھا لیکن اب جو چیز چھپ چکی ہے اس کو بدلنا بہت مشکل ہے۔

(بہ شکریہ ماہنامہ "فیضان" فیصل آباد، شمارہ اگست، ستمبر، اکتوبر 1978ء)

ماخوذ از ماہنامہ العاقب لاہور شمارہ اپریل 2014 (ختم نبوت نمبر)